www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

May 2018 • Rs. 30

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

مئی No 498 | 2018

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

فہرست

روزہ برائے ترک	4	موت کا واقعہ	29
رزق پلس	5	امن ایک اقدام	30
تذکیر بالقرآن	6	محبت انسانی	32
آسان برائے ذکر	7	عذاب سے نجات	33
حجت کا دور	8	انبیاء کا نمونہ	34
دعوت کیا ہے	10	دعوت حق کا استقبال	35
امت کا رول	11	عظمت رفتہ کی بازیابی	36
نبیوں کا ماڈل	14	فضیلتِ رسول	37
رجز کو چھوڑو	17	دین اکابر	38
احسن القصص کا اعادہ	18	جذباتی اشو	39
دور قدیم، دور جدید	19	عہد شباب	40
دعا کی حقیقت	20	طالب علمی کا دور	24
تکریم بنی آدم	23	مشتبہ اظہار رائے	43
رحمت خداوندی	24	حالاتِ حاضرہ	44
اسلامی روحانیت	25	دشمن میں دوست	45
الرسالہ مشن	26	خبرنامہ	46
دین کے دو درجے	28		

Retail Price	Rs 30/- per copy
Subs. by Book Post	Rs 300/- per year
Subs. by Reg. Post	Rs 400/- per year
International Subs.	USD 20 per year

Electronic Money Order (EMO)

Al Risala Monthly
1, Nizamuddin (W), Market
New Delhi-110 013

Bank Details

Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/C No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000.
Nizamuddin West Market
New Delhi - 110013

Customer Care Al-Risala

Call/Whatsapp/SMS: **+91-8588822679**

Ph. No. **011 41827083**

cs.alrisala@gmail.com

www.cpsglobal.org

Goodword Customer Care

+9111-46010170

+91-8588822672

sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Paytm Accepted Here
Mobile: 8588822679

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi-110 051
Total Pages: 52

روزہ برائے ترک

روزہ کے بارے میں ایک حدیث قدسی آئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: روزہ (صوم) میرے لیے ہے، اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔ روزہ دار میرے لیے اپنی شہوت کو چھوڑتا ہے۔ وہ میرے لیے اپنا کھانا اور اپنا پانی چھوڑتا ہے۔ اور روزہ ڈھال ہے۔ اور روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی جب کہ وہ روزہ کھولتا ہے، اور دوسری خوشی جب کہ وہ اپنے رب سے ملے گا۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7492)۔

روزہ کی اصل اہمیت اس کی اسپرٹ میں ہے، نہ کہ اس کے فارم میں۔ روزہ کی حقیقت ترک (چھوڑنا) ہے۔ روزہ میں روزہ دار یہ کرتا ہے کہ وہ مخصوص اوقات میں عارضی طور پر کھانا اور پانی چھوڑ دیتا ہے۔ اس چھوڑنے کے عمل کا اللہ کے یہاں بہت بڑا درجہ ہے۔ بشرطیکہ یہ چھوڑنا خالص اللہ کے لیے ہو۔ روزہ میں کھانے اور پینے کا ترک علامتی ترک ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ روزہ دار اپنی عادت کو یا اپنی کسی محبوب چیز کو اللہ کے خلاف سمجھ کر چھوڑ دے۔

سچا روزہ دار وہ ہے جو رمضان کے مہینہ میں یہ طے کرے کہ وہ اپنی قابل ترک عادتوں کو دریافت کرے گا۔ اور ہر دن کم از کم ایک عادت کو اللہ کے لیے چھوڑ دے گا۔ یہ گویا اللہ کے لیے ایک خود انضباطی (self discipline) کا معاملہ ہے۔

اس خود انضباطی کے عمل میں چھوڑنے کی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً ایک سنی ہوئی بات کو بلا تحقیق دوسروں سے بیان کرنا۔ مجلس میں ہنسنا اور مذاق اڑانا۔ ایک آدمی بول رہا ہو تو اس کی بات ختم ہونے سے پہلے بولنا۔ وعدہ کرنے کے بعد اس کو پورا نہ کرنا۔ غیر سنجیدہ گفتگو کرنا۔ منفی رویہ اختیار کرنا۔ ایک دوسرے پر فخر کرنا۔ بات چیت میں بے احتیاطی کا انداز اختیار کرنا۔ دسترخوان پر کھانا اور پانی چھوڑنا۔ تکلف کا طریقہ اختیار کرنا۔ دھکا دے کر آگے بڑھنا۔ دلیل کے بجائے عیب جوئی کی زبان بولنا۔ زیادہ بولنا یا زور زور سے بولنا، وغیرہ۔

رزق پلس

قرآن میں روزے کا حکم سورہ البقرۃ کی آیات 187-183 میں آیا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں روزے کے بارے میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ مثلاً مشکوۃ المصابیح میں کتاب الصوم کے تحت جو حدیثیں آئی ہیں، ان کی تعداد 152 ہے، اور ابوبکر الفریابی کی کتاب الصیام میں ایسی احادیث کی تعداد 192 ہے۔ رمضان کے روزوں کے بارے میں ایک طویل روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس روایت کا ایک جزء یہ ہے: وَشَهْرٌ يَزْدَادُ فِيهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ (صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر 1887)۔ یعنی اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ رزق بڑھانے سے مراد مادی رزق بڑھانا نہیں ہے، بلکہ روحانی رزق (spiritual food) بڑھا دینا ہے۔ رمضان میں مومن وہی رزق لیتا ہے، جو رزق وہ عام مہینوں میں لیتا ہے۔ لیکن نفسیاتی اعتبار سے رمضان کا رزق مومن کے لیے رزق پلس (Rizq Plus) بن جاتا ہے۔

حضرت مریم کے جس رزق پر حضرت زکریا کو تعجب ہوا تھا، وہ یہی رزق پلس (آل عمران، 3:37) تھا۔ یعنی بظاہر حضرت مریم کا رزق وہی تھا، جو دوسرے تمام لوگوں کو ملتا ہے۔ لیکن حضرت مریم کی روحانی ترقی (spiritual development) کی بنا پر ان کا رزق، رزق پلس بن جاتا تھا۔ یعنی رزق کو لیتے ہوئے ان کے اندر ربانی خیالات جاگتے تھے۔ شکر الٰہی کے نئے نئے آئٹم ان کے ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔ اس بنا پر ان کی زبان سے ذکر اور دعا کے نئے نئے کلمات ادا ہوتے تھے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اس کی تفسیر یہ کردی کہ موسم سرما میں موسم گرما کے پھل، اور موسم گرما میں موسم سرما کے پھل۔

رمضان کا رزق ایسے انسان کے لیے رزق پلس بن جاتا ہے، جو رمضان سے پہلے اللہ کی یاد اور اللہ کے شکر میں جیتا ہو، ایسا آدمی گویا بیدار آدمی ہے۔ اس کی بیداری اس کے لیے رمضان کے رزق میں نئے ربانی پہلو کا اضافہ کردیتی ہے۔ یہی مطلب ہے رزق کے رزق پلس ہونے کا۔

تذکیر بالقرآن

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ (50:45)۔ یعنی پس تم قرآن کے ذریعہ اس شخص کو نصیحت کرو جو میری وعید سے ڈرے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن سے تذکیر یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی وعید یاد دلا کر انھیں متنبہ کیا جائے، اور اس کے مطابق ان کو ذمہ دارانہ زندگی گزارنے پر تیار کیا جائے۔

وعید کا لفظی مطلب ہے، ڈراوا (warning)۔ یہ ڈراوا کیا ہے۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈراوا یہ ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ خالق نے اس دنیا میں انسان کو جو نعمتیں دی ہیں، اس کے ساتھ ایک لازمی ذمہ داری وابستہ ہے۔ وہ یہ کہ آخرت میں انسان سے یہ پوچھا جائے کہ تم نے زندگی میں ملی نعمتوں کا اعتراف کیا یا تم نے بے اعترافی کی زندگی گزاری۔ یہ حقیقت قرآن کی آیت سے معلوم ہوتی ہے: ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (102:8)۔

انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، جو اس کے لیے کسٹم میڈ دنیا (custom-made world) ہے۔ پیدا ہوتے ہی انسان کو وہ تمام چیزیں ملنے لگتی ہیں، جن پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔ مثلاً پانی، غذا، روشنی، آکسیجن، کشش ارض (gravitational pull)، وغیرہ، وغیرہ۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں، جو انسان کی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہیں، اور وہ سب پیشگی طور پر زمین کے اوپر مہیا کر دی گئی ہیں۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ ان نعمتوں کو پہچانے، وہ ان نعمتوں کو شعور کی سطح پر دریافت کرے، وہ ان نعمتوں کا اعتراف (acknowledge) کرے۔

ان نعمتوں کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (31:12)۔ نعمتوں کے اعتراف کے لیے انسان مجبور نہیں ہے۔ لیکن اعتراف یا بے اعترافی، دونوں کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا، یعنی اعتراف پر انعام ہے اور بے اعترافی پر شدید پکڑ ـــــ اس حقیقت کو قرآن کے ذریعہ سے کھولنے کا نام تذکیر بالقرآن ہے۔

آسان برائے ذکر

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (54:17)۔ یعنی ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔ قرآن کی اس آیت کو سمجھنے کے لیے اس کی تفسیر ایسے انداز میں کی جانی چاہیے، جو انتہائی حد تک عام فہم ہو، اس کا قدر مشترک یہ ہو کہ قرآن سے ہر انسان بہ آسانی نصیحت لے سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر جو بھی کی جائے، اس کے اندر کمال درجے میں وضوح (clarity) پائی جاتی ہو۔

مثلاً قرآن کی اس آیت کو آپ پڑھیں، اور اس میں غور کریں: وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (16:8)۔ یعنی اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے بھی اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

قرآن کے تصور تیسیر کے مطابق آپ غور کریں تو اس میں آپ کو نصیحت کا یہ بالکل آسان پہلو ملے گا کہ خالق نے پہلے دور میں انسان کو فطرت کی سواریاں دیں، مثلاً گھوڑا، خچر اور گدھا۔ پھر فطرت (nature) میں ایسی ٹکنالوجی رکھ دی، جس کو دریافت کرکے آدمی موٹر کار اور ہوائی جہاز جیسی مشینی سواریاں بنائے، اور اس کے ذریعہ اس کے لیے زیادہ تیز رفتار سفر ممکن ہو جائے۔

یہ تفسیر مبنی بر تیسیر کی ایک مثال ہے۔ یہ تفسیر ہر آدمی کے لیے قابل فہم ہے۔ اس تفسیر میں ہر عورت اور ہر مرد کے لیے شکر کا سامان ہے۔ جو شخص اس تفسیر کو لے کر سوچے گا، اس کے اندر ربانی شخصیت پرورش پائے گی۔ قرآن کی صداقت پر اس کا یقین بڑھے گا۔ اس کے اندر تخلیقی طرز فکر (creative thinking) بیدار ہوگی۔ اللہ کے وجود کے بارے میں اس کا یقین بہت بڑھ جائے گا —— انھیں صفات کا نام ذکر (نصیحت) ہے۔ یہی وہ صفات ہیں، جو کسی انسان کے اندر ایمان کا وہ درخت اگاتی ہیں، جس کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (14:24)۔ جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔

حجت کا دور

حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔جس میں بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانے میں ایک بڑا فتنہ ظاہر ہوگا۔اس کے قائد کو حدیث میں دجال کا نام دیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو، صحیح مسلم، حدیث نمبر 2937، وابو داؤد، حدیث نمبر 4321، سنن الترمذی، حدیث نمبر 2240، سنن النسائی الکبری ، حدیث نمبر 10717، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4075، مسند احمد، حدیث نمبر 17629، المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7644 وغیرہ۔ایک روایت میں دجال کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: إِنْ يَخْرُجْ وَأَنَا فِيكُمْ، فَأَنَا حَجِيجُهُ دُونَكُمْ، وَإِنْ يَخْرُجْ وَلَسْتُ فِيكُمْ، فَامْرُؤٌ حَجِيجُ نَفْسِهِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2937)۔

ان روایتوں میں کہا گیا ہے کہ دجال کا مقابلہ حجیج کرے گا۔اگر دجال رسول اللہ کے زمانے میں ظاہر ہوگا، تو خود رسول اللہ اس کے مقابلے میں حجیج ہوں گے، اور اگر وہ بعد کے زمانے میں ظاہر ہوگا تو امت کا کوئی فرد اس کے مقابلے میں حجیج ہوگا، اور دجال کو حجت کی سطح پر مغلوب کرے گا۔

حجَ یحج کا معنی ہے حجت سے غالب آنا۔اس کا اسم فاعل ہے حجیج۔اس کا مطلب ہوتا ہے حجت میں غالب آنے والا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال دور حجت (age of reason) میں ظاہر ہوگا۔دجال دور سیف (age of sword) کا فتنہ نہیں ہوگا، بلکہ وہ دور حجت (age of reason) کا فتنہ ہوگا۔

دجال کے بارے میں جو روایتیں ہیں، وہ زیادہ تر تمثیل کی زبان میں ہیں۔ان روایتوں کو سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ تمثیل کی زبان کو تعیین کی زبان میں بدلا جائے۔اس کام کا اصول کیا ہوگا۔وہ اصول یہ ہوگا کہ دور حجت کا مطالعہ کیا جائے، اور دور حجت کے احوال کے اعتبار سے احادیث کی تشریح کی جائے۔

مثلاً دجال کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ وہ اعور ہوگا۔اعور کا لفظی مطلب ہوتا ہے

یک چشم یعنی ایک آنکھ والا (one-eyed)۔لیکن اس سے مراد وہ انسان ہے جولوگوں کو بری رہنمائی دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کی اصل صفت یہ ہوگی کہ وہ لوگوں کے ساتھ غلط رہنمائی (mislead) کا معاملہ کرے گا۔ چوں کہ غلط رہنمائی کا عمل وہ نہایت ہوشیاری کے انداز میں انجام دے گا،لوگ اس کی غلط رہنمائی کو صحیح رہنمائی سمجھ لیں گے، اس لیے اس کو حدیث میں دجال (the Great Deceiver) کہا گیا ہے۔

یہ بات کہ دجال کا ظہور دورِ حجت میں ہوگا۔اس میں ان لوگوں کے لیے رہنمائی ہے جو دجال کے مقابلے کے لیے نکلیں۔ ان کو جاننا چاہیے کہ دجال کا مقابلہ نہ تلوار سے ہوگا ، اور نہ بندوق (gun) سے ہوگا۔ بمباری یا خودکش بمباری (suicide bombing) بھی دجال کے مقابلے کے لیے بالکل کارآمد نہ ہوگی۔ دجال کا کامیاب مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ اس زمانے کے لوگ حجت کی زبان سیکھیں۔ تاکہ وہ اسی زبان میں دجال کا مقابلہ کرسکیں،جس زبان میں دجال لوگوں کو گمراہ کررہا ہوگا۔تاریخ کے دوسرے فتنوں کے مقابلے میں یہ ایک مختلف فتنہ ہوگا۔

قدیم دور کے تمام فتنے،تشدد (violence) کے فتنے تھے۔قدیم دور کے ارباب فتنہ تشدد کے ہتھیار کے ذریعہ لوگوں کو مغلوب کرتے تھے۔لیکن بعد کے زمانے میں ظاہر ہونے والا یہ فتنہ حجت (reason) کے ذریعہ گمراہ کرے گا۔ ایسی حالت میں جولوگ حجت کے ذریعے دجال کے فریب میں مبتلا ہوں، ان کو دجالی فریب سے نکالنے کے لیے دوبارہ حجت یعنی عقلی استدلال کا طریقہ استعمال کرنا ہوگا۔

اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ ان لوگوں کی خصوصی مدد کرتا ہے، جو اللہ کے دین کی مدد کے لیے اٹھیں (الحج،22:40)۔اللہ کی یہ مدد یقینی طور پر اس نسبت سے آتی ہے،جس نسبت سے عمل مطلوب ہے۔ اس اعتبار سے غور کیا جائے تو دجالی فتنے کے زمانے میں جو مقابلہ ہوگا، وہ مبنی بر عقل (reason-based) مقابلہ ہوگا۔اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ دجالی فتنہ کے زمانے میں اللہ تعالی ایسے دلائل عقلی کا ظہور فرمائے،جس کی مدد سے اہل ایمان دجالی فتنے کا کامل خاتمہ کرسکیں۔

دعوت کیا ہے

دعوت کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جو سچائی بیان کی گئی ہے، اس کو دوسروں تک پہنچانا۔ مگر پہنچانے کا مطلب صرف پہنچانا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ جو بات کہی جائے، وہ مخاطب کے ذہن کو ایڈریس کرنے والی ہو۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا (4:63)۔ یعنی ان کو اس طرح بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔ اس طرح دعوت میں ایک اور عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور وہ ہے مدعو کے ذہن کی رعایت۔

اگر آپ دعوت کا کام اس طرح کریں کہ قرآن وحدیث میں جو بات کہی گئی ہے، خود اپنے ذہن کے مطابق، اس کی شرح کر دیں تو یہ حقیقی معنوں میں دعوت کا کام نہیں ہوگا۔ کوئی کلام اس وقت دعوت بنتا ہے، جب کہ آپ اپنی دعوت میں دو تقاضوں کو پورا کریں۔ ایک یہ کہ آپ قرآن وسنت کا مطالعہ غیر متاثر ذہن کے ساتھ کریں، اور اس کا مدعا بے کم وکاست انداز میں جاننے کی کوشش کریں، اور پھر اس کو تقریر یا تحریر کے ذریعہ مخاطب کے سامنے بیان کریں۔

مگر مطلوب دعوت کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے۔ مطلوب دعوت وہ ہے، جس میں داعی غیر جذباتی انداز میں مدعو کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کرے، اور پھر مدعو کے ذہن کو ایڈریس کرنے والے انداز میں خیر خواہانہ طور پر اس کو اپنا مخاطب بنائے۔ دعوت اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے دوسری تحریکوں کی طرح ایک تحریک ہے۔ مگر دعوت اور دوسری تحریکوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ دوسری تحریکیں عام طور پر ردعمل کے ذہن کے تحت چلائی جاتی ہیں۔ یعنی سماج میں کوئی چیز نظر آئی جو دیکھنے والوں کے لیے بظاہر غلط تھی۔ اس پر دیکھنے والوں نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا، اور یہ ردعمل دھیرے دھیرے ایک تحریک بن گیا۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو تمام تحریکیں عملاً ردعمل کی تحریکیں ہوتی ہیں۔ لیکن دعوت کی تحریک کسی بھی درجے میں ردعمل کی تحریک نہیں ہے۔ دعوت داعی کی طرف سے نصح (well-wishing) کا اظہار ہے، اور بس۔

امت کا رول

قرآن میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (25:1)۔یعنی بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) اتارا تاکہ وہ سارے عالم کے لئے خبردار کرنے والا بنے۔

قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا۔اس وقت پیشین گوئی (prediction) کی زبان میں یہ اعلان کیا گیا کہ قرآن سارے عالم میں پھیلے گا، یہاں تک کہ اس کا پیغام زمین پر بسنے والے ہر مرد اور ہر عورت تک پہنچ جائے گا۔

یہی بات حدیث رسول میں اس طرح بیان کی گئی ہے: لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ، وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ، بِعِزِّ عَزِيزٍ أَوْ ذُلِّ ذَلِيلٍ (مسند احمد، حدیث نمبر 23814)۔یعنی زمین پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر نہیں بچے گا، مگر اللہ اس کے اندر اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا، عزت والے کو عزت کے ساتھ، ذلت والے کو ذلت کے ساتھ۔(یعنی اسلام کا پیغام ماننے والوں تک بھی اور نہ ماننے والوں تک بھی)۔

یہ حدیث رسول پیشگی خبر کی زبان میں یہ بتا رہی ہے کہ آخری دور میں امت کا فائنل رول کیا ہوگا۔ وہ رول یہ ہوگا کہ امت اپنے زمانے کے مواقع کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کے کلام (word of God) کو دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا دے، یہاں تک کہ کوئی عورت یا مرد اس سے بے خبر نہ رہے۔اس حدیث میں کلمۃ الاسلام سے مراد قرآن ہے۔قرآن کو ہر انسان تک پہنچانا کسی پراسرار طریقے پر نہیں ہوگا، بلکہ وہ دوسرے واقعات کی طرح اسباب کے ذریعے ہوگا۔ بعد کے دور میں ایسے اسباب انسان کے دسترس میں آئیں گے جن کو استعمال کرکے امت خدا کی کتاب کو تمام انسانوں تک پہنچا دے۔

قرآن کو سارے عالم تک پہنچانا ایک ایسا کام ہے جو امت مسلمہ محض اپنی طاقت سے نہیں

کرسکتی۔ اس لیے اللہ نے تاریخ کو اس طرح مینج (manage) کیا کہ دوسری قومیں بھی اس تاریخی کام میں تائیدی رول (supporting role) ادا کریں۔ یہی بات حدیث رسول میں اس طرح بیان کی گئی ہے: إِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الفَاجِرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3062)۔ اللہ ضرور اس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعے بھی کرے گا۔ اس حدیث میں فاجر انسان سے مراد سیکولر انسان ہے۔ یعنی مستقبل میں ایسے لوگ اٹھیں گے جو بظاہر اپنے مادی مقاصد کے لیے اسباب پیدا کریں گے، مگر یہ اسباب عملاً اہل دین کے لیے سپورٹ بن جائیں گے۔

اس حدیث میں سیکولر موید (secular supporter) سے مراد وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں مغربی تہذیب (western civilization) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک مادی تہذیب ہے۔ اس نے اپنے مادی مقاصد کے لیے بہت سے نئے اسباب پیدا کیے۔ مگر یہ اسباب عملاً قرآن کی عالمی اشاعت کا ذریعہ بن گئے۔

مغربی تہذیب نے پہلی بار دنیا کے جغرافیہ کو پوری طرح ایک معلوم واقعہ بنا دیا۔ مذہبی آزادی موجودہ زمانے میں انسان کا ایک مسلمہ حق (accepted right) بن گئی۔ موجودہ زمانے میں پرنٹنگ پریس اور الیکٹرانک کمیونی کیشن جیسی چیزیں وجود میں آئیں جن کے ذریعے پہلی بار عالمی ابلاغ (global communication) ممکن ہو گیا۔ لائبریری کلچر آخری حد تک عام ہو گیا ہے۔ سیاحت (tourism) کا ظاہرہ وجود میں آیا، جس کی صورت میں گویا مدعو خود داعی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ لوگوں میں کھلا پن (openness) کا مزاج پیدا ہوا، جس کی بنا پر لوگ غیر متعصّبانہ انداز میں مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے لگے، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے اسباب اہل دین کے لیے تائید (support) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ اہل دین ان کو استعمال کر کے قرآن کے اعلان اور پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کو واقعہ بنا دیں۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اہل دین اٹھیں اور قرآن کو تمام انسانوں تک پہنچا دیں تاکہ انسان اس خدائی ہدایت سے رہنمائی لے کر اپنی دنیا اور آخرت کو کامیاب

بنا سکے۔ اکیسویں صدی میں قرآن کی عالمی تبلیغ آخری حد تک ممکن ہوچکی ہے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کی شرط صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ نفرت اور تشدد کے کلچر کو مکمل طور پر ختم کردے۔ وہ پرامن ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے، تمام قوموں تک قرآن کا پیغام پہنچادے۔

ہر انسان پیدائشی طور پر حق کا متلاشی ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت کے زور پر حق کا طالب بنا ہوا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں مسلمان اپنی غلط سوچ کے تحت نفرت اور تشدد کے کلچر میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اس کلچر نے داعی اور مدعو کے درمیان دوری کا ماحول قائم کردیا ہے۔ امت مسلمہ پر فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر نفرت اور تشدد کے موجودہ کلچر کو ختم کردے، اور پوری طرح امن کا ماحول قائم کردے۔ اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوگا کہ قرآن کا پیغام ہر جگہ پہنچنے لگے گا۔ آج امت مسلمہ کو یہ کرنا ہے کہ وہ نفرت اور تشدد کے کلچر کو ختم کرکے امن کلچر کو اپنائے، اور دعوت کی پرامن پلاننگ (peaceful planning) کرے، اور خالص پرامن انداز میں سارے عالم تک اللہ کے پیغام کو پہنچادے۔ یہی امت مسلمہ کا فائنل رول ہوگا۔ اسی رول کی ادائیگی کے نتیجے میں امت مسلمہ کو دوبارہ وہ سرفرازی حاصل ہوگی جس کا تاریخ کو انتظار ہے۔

دعوت کی اس عالمی مہم کے لیے دوسرے معروف طریقوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ خالص مثبت ذہن کے تحت اعلیٰ معیار کا ایک ٹی وی چینل قائم کیا جائے۔ اس کے ذریعے تمام بڑی بڑی زبانوں میں دعوتی پروگرام نشر کیے جائیں۔ یہ کام مکمل طور پر پرامن دعوت کے تصور کے تحت کیا جائے۔ اس میں نہ مسلمانوں کی مفروضہ مظلومیت کی داستان کا ذکر ہو اور نہ مسلم فخر کا تذکرہ کیا جائے۔ اس ٹی وی کی نشریات تمام تر دعوت الی اللہ کے اصول پر مبنی ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی نشریات لازمی طور پر عصر حاضر کے اسلوب میں ہوں تاکہ وہ آج کے انسان کے ذہن کو ایڈریس کرسکیں۔ جدید ٹکنالوجی نے اس بات کو پوری طرح ممکن بنادیا ہے کہ خداوندِ رب العالمین کا پیغام ہر گھر میں اور ہر انسان تک پہنچ جائے۔ عالمی دعوت کا یہی وہ واقعہ ہے جس کو حدیث میں شہادتِ اعظم کہا گیا ہے: هَذَا أَعْظَمُ النَّاسِ شَهَادَةً عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِينَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2938)۔

نبیوں کا ماڈل

ہر زمانے میں اور ہر مقام پر اللہ کے پیغمبر انسان کی ہدایت کے لیے آئے۔ ایک روایت کے مطابق، ان نبیوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361) سے زیادہ تھی۔ ان تمام پیغمبروں کا ماڈل بنیادی طور پر ایک تھا۔ پیغمبروں نے اس ربانی ماڈل کو اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے زمانے میں اختیار کیا۔ اس سلسلے میں قرآن کی کچھ آیتوں کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

یہ ہے ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ بے شک تمھارا رب حکیم اور علیم ہے۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے، ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت دی اس سے پہلے۔ اور اس کی نسل میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم نیکوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی، ان میں سے ہر ایک صالح تھا۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی، اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ اور ان کے باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی، اور ان کو ہم نے چن لیا اور ہم نے سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس سے سرفراز کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ضائع ہو جاتا جو کچھ انھوں نے کیا تھا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی۔ پس اگر یہ مکہ والے اس کا انکار کر دیں تو ہم نے اس کے لئے ایسے لوگ مقرر کر دئے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی، پس تم بھی ان کے طریقہ پر چلو۔ کہہ دو، میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ تو بس ایک نصیحت ہے دنیا والوں کے لئے۔ (6:83-90)

یہ ربانی ماڈل بنیادی طور پر دو اصولوں پر مشتمل تھا — توحید کی پر امن دعوت، رُجز

(المدثر، 74:3-5) سے کامل پرہیز۔ ہر پیغمبر نے بنیادی طور پر اسی ماڈل کی پیروی کی۔ البتہ حالات کے اعتبار سے ہر ایک کا انطباق (application) مختلف تھا۔ ان کے درمیان ظاہری فرق کو نظر انداز کیا جائے تو ہر پیغمبر کا ماڈل اصولی طور پر ایک نظر آئے گا۔

رُجز (المدثر، 74:5) کا لفظی مطلب گندگی (dirt) ہے۔ رُجز کا لفظ یہاں مشن کی نسبت سے آیا ہے۔ اس اعتبار سے غور کیا جائے تو یہاں ترکِ رُجز کا مطلب یہ ہے کہ نزاعی طریقہ (confrontational method) سے پرہیز کرو اور اپنے کام کے سلسلے میں ہمیشہ غیر نزاعی طریقہ (non-confrontational method) اختیار کرو۔ رُجز کا یہ مفہوم ایک روایت پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ ایک روایت میں آپ کے بارے میں بتایا گیا ہے: مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ، أَحَدُهُمَا أَيْسَرُ مِنَ الْآخَرِ، إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2327)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو معاملے میں سے ایک کے انتخاب کا اختیار دیا گیا، جن میں سے ایک دوسرے سے آسان ہوتا تو آپ نے آسان طریقہ چنا۔

آسان طریقہ کیا ہے، اور مشکل طریقہ کیا ہے۔ آسان طریقہ وہ ہے جو مسئلے کو مسئلے تک محدود رکھے۔ اس کے مقابلے میں مشکل طریقہ وہ جو اصل مسئلہ میں دوسرے مسئلے کا اضافہ کردے۔ مثلاً یہ بات واضح ہے کہ توحید کا داعی اگر دعوت کے ساتھ ٹکراؤ کا طریقہ شامل کرلے تو یقیناً بات بڑھے گی۔ اب پیس فل گفت وشنید کے ساتھ ٹکراؤ اور تشدد کی صورتیں شروع ہوجائیں گی۔ اس طرح پرامن مشن ڈی ریل (derail) ہوکر ایسے راستوں پر چل پڑے گا جہاں اصل مقصد گم ہوجائے گا، اور تعمیر کے بجائے تخریب کی صورت پیدا ہوجائے گی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے پیغمبروں کے حالات قرآن وحدیث سے معلوم ہوتے ہیں، اس سے اس اصول کی تصدیق ہوتی ہے۔

پیغمبر کا نمونہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جتنے بھی پیغمبر آئے ان سب کا مشن ایک تھا۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ

(21:25)۔ یہ تمام مقامات جہاں اللہ کے پیغمبر آئے۔ ان میں سے ہر ایک مقام میں شرک کے مراکز، بت خانوں کی صورت میں موجود تھے۔ لیکن تمام پیغمبروں نے دو چیزوں میں فرق کیا۔ انھوں نے ہر جگہ لوگوں کو پرامن طور پر توحید کی اصولی دعوت پیش کی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شرک کے مراکز (centres of *shirk*) کے ساتھ عملی ٹکراؤ سے کامل طور پر پرہیز کیا۔ یہ گویا ڈی لنکنگ کی پالیسی (policy of delinking) تھی۔ یعنی توحید کی طرف لوگوں کو پرامن انداز میں بلانا اور اسی کے ساتھ اہل اقتدار سے عدم ٹکراؤ کی پالیسی پر شدت کے ساتھ قائم رہنا۔

یہی طریقہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تھا۔ آپ کی بعثت ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں ہوئی۔ اس وقت مکہ کا یہ حال تھا کہ کعبہ کی عمارت کو عملاً بت پرستی کا مرکز بنا دیا گیا تھا، اور اس کا انتظام قبائلی پارلیمنٹ (دار الندوہ) کے تحت کیا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منظر کو دیکھا، مگر اس سے عملی طور پر کامل اعراض کرتے ہوئے، آپ نے توحید کی پرامن دعوت لوگوں کے درمیان شروع کر دی۔

☆☆☆☆☆☆

ماضی اور حال کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہر انسان آخر کار احساسِ خسران میں مرتا ہے۔ کوئی شخص دولت کماتا ہے، کوئی عزت حاصل کرتا ہے، کوئی سیاسی اقتدار پر قبضہ کرتا ہے، کوئی لیڈر بن کر ابھرتا ہے، لیکن ہر شخص اپنی مطلوب منزل پر پہنچنے سے پہلے مرجاتا ہے۔ ہر شخص کے ذہن میں خوشیوں کی ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔ وہ اس کو پانے کے لیے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ مگر ہر آدمی کا خاتمہ آخر کار اس احساس کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مطلوب دنیا کو نہ پاسکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آدمی کی خواہشات لامحدود ہیں۔ مگر موجودہ دنیا ایک محدود دنیا ہے۔ اس محدود اور غیر معیاری دنیا میں لامحدود قسم کی معیاری خوشی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ طالب اور مطلوب کے درمیان یہی فرق خسران کا اصل سبب ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی یاد دہانی ہے کہ انسان کی مطلوب دنیا موت کے بعد کے دور حیات میں رکھ دی گئی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس کی تیاری کرے۔

رُجز کو چھوڑو

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ اس وقت آپ کو ایک بنیادی ہدایت یہ دی گئی کہ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74:5)۔ یعنی رجز کو چھوڑ دے۔ رجز کا مطلب گندگی ہے۔

وہ رجز کیا تھا جس کو آپ نے چھوڑ کر اپنا مشن چلایا۔ اس کی تفصیل آپ کی سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس کا تعلق آپ کے مشن کے طریقہ کار (method) سے تھا۔ اگر رسول اللہ کی عملی روش کو لے کر اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ نزاعی طریقہ کار (confrontational method) کو چھوڑو، اور غیر نزاعی طریقہ کار (non-confrontational method) کو اختیار کرو۔

رسول اللہ کی سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنا مشن پوری طرح غیر نزاعی اصول پر چلایا۔ کعبہ میں اس وقت کے لوگوں نے 360 بت رکھ دیے تھے۔ مگر آپ نے اس سے ٹکراؤ نہیں کیا، بلکہ اس سے اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ مکہ میں دارلندوہ (tribal parliament) تھا۔ مگر آپ نے اس میں قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اس سے مکمل طور پر اعراض کرتے ہوئے اپنا مشن غیر سیاسی انداز میں چلایا۔ مکہ کے سرداروں نے کہا کہ آپ مکہ چھوڑ دیجیے، تو آپ نے ان کے اس فیصلہ پر کوئی ٹکراؤ نہیں کیا، بلکہ خاموشی کے ساتھ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گیے۔

اس واقعے کی روشنی میں رجز کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر قسم کے ٹکراؤ کو چھوڑتے ہوئے، اپنا مشن جاری رکھا جائے۔ یعنی مذہبی ٹکراؤ، سیاسی ٹکراؤ، قومی ٹکراؤ، حقوق کا ٹکراؤ، وغیرہ سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہوئے توحید کا مشن جاری رکھا جائے۔ یہی طریقہ ابدی طور پر اہل اسلام کا طریقہ ہے۔ وہ جس ملک یا جس زمانے میں ہوں، ہر جگہ میں اسی غیر نزاعی طریقہ کو اختیار کرنا ہے۔ یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق کوئی اور طریقہ کامیابی کا طریقہ نہیں ہوسکتا۔

احسن القصص کا اعادہ

قرآن میں پیغمبر یوسف کے واقعہ کو احسن القصص (best story) کا ٹائٹل دیا گیا ہے (یوسف، 12:3)۔ احسن القصص کا مطلب ہے بہترین طریقِ کار (best method)۔ اللہ تعالی نے تاریخ میں حضرت یوسف کے ذریعہ ایک عملی مثال قائم کی، اور اس طرح ہر زمانے کے اہل ایمان کو یہ ہدایت دی کہ تم اپنے حالات کے اعتبار سے اس کامیاب طریقِ کار کو اختیار کرو۔ اس طریقِ کار کا خلاصہ تھا —— اتھاریٹی کے ساتھ ٹکراؤ نہ کرنا، اور موجود مواقع کو پرامن انداز میں استعمال کرنا۔

حضرت یوسف کے زمانے میں یہ طریقِ کار مصر کے ایک بادشاہ کے ذاتی ذوق کے بنا پر ممکن ہوا تھا۔ موجودہ زمانے میں انسانی تاریخ ایک نئے دور میں پہنچی ہے۔ اب جدید دور کے مسلمہ اصول (accepted norm) کے تحت یہ ممکن ہو گیا ہے کہ احسن القصص کا اعادہ زیادہ وسیع پیمانے پر کیا جائے، اور دعوت کو احسن القصص کے اصول پر منظم کر کے عالمی کامیابی حاصل کی جائے۔

قدیم مصر میں حضرت موسیٰ کے زمانے میں جو بادشاہ حکومت کرتا تھا، وہ ایک جابر بادشاہ (despotic king) تھا۔ اس کے زمانے میں پیغمبر کے لیے یہ موقع نہیں تھا کہ وہ احسن القصص کے اصول کو استعمال کریں۔ لیکن اس سے پہلے حضرت یوسف کے زمانے میں مصر میں ایک اور بادشاہ کی حکومت قائم تھی، جو مختلف مزاج کا حامل تھا۔ اس کے مخصوص مزاج کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ حضرت یوسف احسن القصص کے مطابق وہاں اپنا کام کریں۔ حضرت یوسف کے معاصر بادشاہ نے حضرت یوسف سے کہہ دیا کہ تم مصر کے اقتصادی نظام کو اپنی مرضی کے مطابق چلاؤ، میری شرط صرف یہ ہے کہ تم کو سیاسی تخت کے معاملے میں میرے ساتھ ٹکراؤ سے اعراض کرنا ہے (Only I, as king, will be greater than you.)۔ اب موجودہ زمانے میں ممکن ہو گیا ہے کہ اس حسن تدبیر کو زیادہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آج کے اہل ایمان حضرت یوسف کی طرح وقت کی پولیٹکل اتھاریٹی کے ساتھ ٹکراؤ سے یک طرفہ طور پر اعراض کریں۔

دورقدیم، دورجدید

دورقدیم اور دورجدید اصلاً یہ ہے کہ دورقدیم مبنی برعقیدہ علم پر قائم تھا، اور دورجدید مبنی بر دریافت علم پر قائم ہے۔ سائنس اسی کا نام ہے کہ علوم فطرت کے مطالعے سے جو چیز دریافت ہو، اس کو مان لیا جائے، اور جو چیز فطرت کے مطالعے سے دریافت نہ ہو، اس کو انتظار کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ گلیلیو کے زمانے میں جو نزاع تھی، وہ یہی تھی کہ ٹیلسکوپ (telescope) کے مطالعے سے یہ دریافت ہوا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ یعنی ہیلیو سینٹرک تھیری (heliocentric theory)، نہ کہ جیوسینٹرک تھیری (geocentric theory)۔ مسیحی طبقہ اپنے روایتی عقیدہ کے مطابق اس کے خلاف ہوگیا۔ اس لیے دونوں کے درمیان متشددانہ نزاع قائم ہوگئی۔ اب مسیحی طبقہ نے سائنسی دریافت کو مان لیا ہے، اس لیے اب یہ نزاع بھی ختم ہوگئی۔

سائنس کا علم، نہ موافق مذہب علم ہے اور نہ مخالف مذہب علم۔ سائنسی علم دراصل موافق فطرت (pro-nature knowledge) کا نام ہے۔ سائنس سے نزاع کرنا، ایک غیر ضروری کام ہے۔ کیوں کہ سائنس کا موقف کسی نزاع سے متعین نہیں ہوگا، بلکہ صرف اس حقیقت سے متعین ہوگا کہ فطرت کے مطالعے سے کیا بات درست ثابت ہوئی ہے۔ اہل اسلام کے لیے اس معاملے میں یہ سبق ہے کہ وہ مسیحی گروہ کی غلطی کو نہ دہرائیں۔ سائنسی دریافتوں کو وہ مذہبی عقیدہ سے نہ جانچیں۔ بلکہ اس کی واقعیت کو فطرت کے دریافت شدہ قانون کی روشنی میں جانچ کر دیکھیں۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ وہ مغربی سائنس اور مغربی کلچر میں فرق کریں۔ مغربی سائنس مبنی بر دریافت علم کا نام ہے۔ اس کے برعکس، مغربی کلچر مغربی سوسائٹی کا حصہ ہے۔ وہ ایک سماجی ظاہرہ ہے، نہ کہ کوئی علمی طور پر دریافت شدہ حقیقت۔ سائنس کا تعلق حدیث کے مطابق، بصیرت زمانہ سے ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: علی العاقل أن یکون بصیراً بزمانه (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔ یعنی مومن عاقل پر ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو۔

دعا کی حقیقت

دعا اگر صالح دعا ہو تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ لیکن بڑی بڑی دعائیں ہمیشہ تاخیر کے ساتھ قبول ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال حضرت ابراہیم کی دعا ہے۔ حضرت ابراہیم نے تعمیر کعبہ کے وقت ایک آخری پیغمبر کے ظہور کی دعا کی تھی (البقرۃ، 2:129)۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ لیکن اس پیغمبر کا ظہور عملاً دعا کے تقریباً ڈھائی ہزار سال بعد پیش آیا۔ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات ہمیشہ اسی طرح لمبی مدت کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ بڑی بڑی دعاؤں کے لیے پوری تاریخ کو مینج کرنا پڑتا ہے۔ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے، حالات کو اس کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔ اس لیے قانونِ قدرت کے مطابق، کوئی بڑی دعا کبھی اس طرح قبول نہیں ہوتی کہ دعا کرنے والے نے دعا کیا۔ اور اس کے فوراً بعد اس کی قبولیت بھی سامنے آ گئی۔

دعا کے بارے میں قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (2:186)۔ یعنی اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے، پس ان کو چاہیے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر یقین کریں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا بندے کے قریب ہے۔ اور وہ بندے کی دعا کا جواب دیتا ہے۔ لیکن جواب کی صورت کیا ہوتی ہے، اس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں موجود نہیں۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان کے فوراً بعد جو الفاظ آئے ہیں، وہ یہ ہیں: فلیستجیبو لی ولیؤ منوا بی لعلھم یرشدون۔ یعنی ان کو چاہیے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر یقین کریں، اسی میں ان کی فلاح ہے۔

یہاں دعا کے بعد جواب دعا کا ذکر نہیں۔ یہ قرآن کا ایک خاص اسلوب ہے کہ اس میں کسی

بات کے ایک پہلو کا ذکر ایک مقام پر ہوتا ہے، اور اُس کے دوسرے پہلو کا ذکر دوسرے مقام پر۔ مثلاً قرآن میں قصہ آدم کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ آدم نے غلطی کرنے کے بعد جب توبہ کی، تو ان کی توبہ قبول ہوئی، اور دعا کے الفاظ بھی ان کو تلقین کیے گئے۔ مگر یہ دونوں بات ایک جگہ موجود نہیں۔ مثلاً سورہ البقرۃ آیت 37 میں توبہ کا ذکر ہے۔ لیکن جہاں تک الفاظِ دعا کا تعلق ہے، وہ دوسرے مقام پر سورہ الاعراف آیت 23 میں بتائے گیے ہیں۔

یہی اسلوب قرآن کی مذکورہ آیت میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب ریح (یوسف، 12:94) کی صورت میں ملتا ہے۔ ریح کے لفظی معنی خوشبو (fragrance) کے ہیں۔ یہاں ریح کا لفظ سادہ طور پر مہک کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اچھی خبر (good news) ہے۔ یہ حضرت یعقوب کو انسپریشن (inspiration) کی صورت میں آئی تھی۔ یعنی ان کو یہ انسپریشن آتا تھا کہ خدا ان کی دعاؤں کو ضائع نہیں کرے گا، بلکہ یوسف کو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کرے گا۔ یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو اندھے کنوئیں میں ڈال دیا تھا، لیکن اللہ نے ان کو مخصوص انتظام کے تحت مصر کے تخت پر پہنچا دیا۔

دعا کی یہ قبولیت ہر انسان کے لیے مقدر ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ وہ شرط قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (12:90)۔ یعنی جو شخص ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یہ خصوصی نعمت اس انسان کو ملتی ہے، جو احسان کے درجے میں اس کا استحقاق ثابت کرے۔ یعنی ہمیشہ اللہ سے پرامید رہے، اور ہر حال میں وہ صابرانہ انتظار کی روش پر قائم رہے۔

اس معاملے کی ایک مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے 610 عیسوی میں قدیم مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا، لیکن اکثریت آپ کی مخالف بن گئی۔ آخر کار یہ واضح ہوگیا کہ آپ کو مکہ چھوڑنا پڑے گا۔ اس زمانے میں

آپ اللہ سے بہت زیادہ دعائیں کرتے تھے۔ اس کا ثبوت قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا (17:80)۔ یعنی اور کہو کہ اے میرے رب، مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا اور مجھ کو نکال سچا نکالنا۔ اور مجھ کو اپنے پاس سے مددگار قوت عطا کر۔ یہ دعا قبول ہوئی، لیکن الفاظ کی صورت میں نہیں، بلکہ واقعات کی صورت میں۔

اس زمانے میں ہجرت سے تقریباً دو مہینہ پہلے وہ واقعہ ہوا، جو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ بظاہر دعا کے جواب کے طور پر پیش نہیں آیا۔ مگر یہ وہی چیز تھی جس کو قرآن میں ریح (یوسف، 12:94) کہا گیا ہے۔ یعنی اس موقع پر آپ کو یہ انسپریشن ملا کہ تمھاری دعا نہایت اعلیٰ صورت میں قبول ہونے والی ہے۔ پیغمبر اسلام نے مدخل ومخرج کی دعائیں کی، لیکن اسی کے ساتھ آپ خصوصی طور پر تقویٰ اور صابرانہ روش کے ساتھ درجۂ احسان پر قائم رہے۔ آپ نے اس معاملے میں خدائی ریح پر بھروسہ کیا۔ یہاں تک کہ نبوت کے تیرھویں سال ہجرت مدینہ کا واقعہ پیش آیا۔ جو اسلام کی تاریخ کے لیے ایک بڑا انقلابی مرحلہ (breakthrough) ثابت ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے کچھ پہلے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا: أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرَى، يَقُولُونَ يَثْرِبُ، وَهِيَ الْمَدِينَةُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1871)۔ یعنی مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے، جو بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، وہ مدینہ ہے۔

دعا کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: الدُّعَاءُ مُخُّ العِبَادَة (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3371)۔ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ دعا حکمت (wisdom) کا خزانہ ہے۔ دعا کا خزانہ خدا کی دوسری رحمتوں کی طرح عام ہے۔ لیکن اس خزانۂ دعا یا اس خزانۂ رحمت سے صرف اس شخص کو حصہ ملتا ہے، جو محسن ہو۔ یعنی تقویٰ اور صبر کے مطلوب معیار پر قائم رہے۔

☆☆☆☆☆

ایمان باللہ وہ ہے جو کسی کو معرفت کی سطح پر ملے، نہ کہ محض تقلید کی سطح پر۔

تکریمِ بنی آدم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خالق نے جب آدم (انسانِ اول) کو پیدا کیا تو اس کو تمام اسماء کا علم دے دیا (البقرۃ2:32)۔ پھر اسی سلسلۂ کلام میں آگے آتا ہے: ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ (2:32)۔ پہلے جزء میں ضمیر ھاء واحد مونث استعمال کی گئی ہے۔ اس کے بعد ضمیر ھم جمع مذکر استعمال ہوئی ہے۔ یہ فرق کیوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا میں ضمیر ہاء سے مراد علم اسماء ہے۔ اس کے برعکس، عرضھم میں ضمیر ھم سے مراد حاملین علم اسماء ہیں۔

تخلیق کے حوالے سے قرآن میں تین الفاظ استعمال کے گیے ہیں۔ پہلا لفظ آلاء (الرحمن، 55:13) ہے، دوسرا لفظ آیات (یوسف، 12:105) ہے، اور تیسرا لفظ جو استعمال ہوا ہے، وہ کلمات (لقمان، 31:27) ہے۔ آلاء سے مراد تخلیقی کرشمہ (marvels of nature) ہے۔ آیات سے مراد تخلیق میں موجود حکمتیں (wisdom content) ہیں۔ کلمات سے مراد معلوماتِ تخلیق (knowledge of creation) ہے۔

خالق نے انسان کے اندر بالقوۃ (potential) اعتبار سے ساری تخلیقی معلومات رکھ دی ہے، جس کو علم آدم الاسماء کلھا میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ معلومات گویا کلمات اللہ ہیں۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ تخلیق کی حکمتوں (آلاء) کو دریافت کرے، اور اس طرح اپنی معرفت کو بڑھائے۔ انسان اگر اس فکری عمل (intellectual process) کو اپنے اندر جاری کرے گا، تو وہ خود دریافت کردہ معرفت (self-discovered realization) کے مقام تک پہنچ جائے گا۔ اس طرح وہ اس قابل ہوجائے گا کہ اپنے اندر اعلیٰ ربانی شخصیت کی تعمیر کرے۔ وہ لوگ جو اپنے اندر اعلیٰ ربانی شخصیت کی تشکیل کریں، وہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے باغوں میں داخل کرنے کے لیے منتخب کیے جائیں گے، اور پھر وہ ابدی طور پر وہاں رہیں گے۔ یہ سارا عمل تدبر کا طالب ہے۔ تدبر اعلیٰ معرفت تک پہنچنے کا زینہ ہے، اور اعلیٰ معرفت جنت میں داخلے کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔

رحمت خداوندی

قرآن میں ایک حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

قرآن کا ایک اصول یہ ہے کہ قرآن میں بڑی بڑی باتیں بالواسطہ انداز میں بیان کی جاتی ہیں۔ تاکہ انسان ان باتوں کو غور وفکر کے ذریعہ دریافت کرے، وہ ان باتوں کو خود دریافت کردہ معرفت کے طور پر جانے۔ یہ انسان کی نفسیات ہے کہ جس بات کو وہ خود دریافت کردہ معرفت کے طور پر جانے، وہ ایسی باتوں کو نہایت گہرائی کے ساتھ اخذ کرتا ہے۔

قرآن کی اس آیت میں انسانی سوچ کو ڈائریکشن (way of thinking) دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے ہمیشہ غلطیاں کرتا ہے (to err is human)۔ ایسے موقع پر انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کو قنوطیت (ناامیدی) سے بچنا چاہیے، اور مبنی بر رحمت سوچ کو اپنانا چاہیے۔ انسان جب اس طرز فکر کو اختیار کرے گا، تو وہ تخلیق کے بارے میں ایک عظیم حقیقت کو دریافت کرے گا۔ وہ یہ کہ انسان کے اندر فطری طور پر یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ اس کے اندر ہر غلطی یا ذنب کے بعد احساس ندامت (repentance) جاگتا ہے۔

اس احساس کے تحت اس کے اندر شدید طور پر ری تھنکنگ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ری تھنکنگ اس کے ذہن کو جگاتی ہے۔ اس کا احساس ندامت اس کی شخصیت کے ارتقا (personality development) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کے اندر ایک ایسا پراسس (process) جاری ہوجاتا ہے، جو اس کی روحانی ترقی کو نئی اونچائیوں تک پہنچا دیتا ہے، وہ اعلیٰ درجہ میں ایک مزکّیٰ انسان بن جاتا ہے۔

اسلامی روحانیت

اسلامی روحانیت اپنی حقیقت کے اعتبار سے تخلیقی روحانیت (creative spirituality) کا نام ہے۔ اسلامی روحانیت دراصل ایسے مومن کی ذہنی پیداوار ہے، جو مسلسل تدبر کے ذریعہ اس قابل ہو گیا ہو، جو روحانی آئٹم (content of spirituality) کو چیزوں سے دریافت کر سکے، اور اس طرح اپنی روحانیت کو ترقی یافتہ روحانیت بنائے۔

قرآن میں اس عمل کو شہد کی مکھی کے عمل کی مثال سے واضح کیا گیا ہے (النحل، 16:68)۔ شہد کی مکھی پھولوں کے اندر موجود نکٹر (nectar) کو نکالتی ہے، اور اس کے مجموعے سے وہ انوکھی چیز بناتی ہے، جس کو شہد کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ ترقی یافتہ انسانی ذہن کا ہے۔ اس معاملے کو قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (12:105)۔ یعنی اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے۔

یہاں قرآن میں آیت سے مراد روحانی نکٹر (nectar of spirituality) ہے۔ مومن کا تیار ذہن جب زمین و آسمان کو دیکھتا ہے۔ تو وہ بار بار چیزوں میں چھپے ہوئے روحانی نکٹر کو دریافت کرتا ہے، اور پھر اس کو اخذ کر کے اپنی فکری ارتقا کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس طرح اس کے اندر ایک روحانی شخصیت جاگتی ہے۔ اس طرح اس کی سوچ ترقی کرتے کرتے اس کو ایک ترقی یافتہ شخصیت (developed personality) بنا دیتی ہے۔

زمین و آسمان کے اندر یہ روحانی نکٹر مادی صورت میں نہیں ہے، جیسا کہ شہد کی مثال میں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ امکان (potential) کے روپ میں ہے، جو دریافت کے ذریعہ انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ شہد کی حیثیت مادی نکٹر کی ہے، اور روحانی آئٹم کی حیثیت توسم کے ذریعہ اخذ کردہ اسپریچول وزڈم (spiritual wisdom) کی۔

الرسالہ مشن

الرسالہ مشن کے تعلق سے میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں الرسالہ مشن کی سب سے بڑی ڈسکوری کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ مائنڈ بیسڈ معرفت، اور پیس بیسڈ ایکٹوزم۔لیکن میرا خیال ہے کہ الرسالہ مشن کی سب سے بڑی ڈسکوری ہے: منصوبہ تخلیق کے مطابق دین کی صحیح تعبیر پیش کرنا۔ پہلی دونوں باتیں اس کی عملی شکلیں ہیں، اقدام کی دنیا میں عملی طور پر یہ دونوں بڑی ڈسکوری ہیں۔مولانا اس پر کچھ تبصرہ فرمائیں۔(مولانا سید اقبال احمد عمری، تامل ناڈو)

میں کہوں گا کہ میری سب سے بڑی ڈسکوری اللہ کی دریافت ہے۔اللہ کی دریافت سے مراد اللہ کو حی و قیوم کی حیثیت سے شعوری طور پر جان لینا۔میرے علم کے مطابق اس ڈسکوری میں شاید مَیں اکیلا ہوں۔اگر آپ کو اس کا تجربہ کرنا ہے تو آپ دنیا کے کسی بڑے عالم کی مجلس میں ایک گھنٹہ بیٹھیے اور دیکھیے کیا آپ کو اس مجلس میں خدا کا زندہ تذکرہ ملتا ہے، یا پھر کسی کتب خانہ میں جا کر تلاش کیجیے کہ کیا کسی شخص نے اللہ رب العالمین کے وجود پر کوئی قابل ذکر کتاب لکھی ہے۔کیا آپ کسی ایسی تحریک کو جانتے ہیں، جس کا مرکز ومحور صرف اللہ ہو۔میرے علم کے مطابق لوگ اللہ پر رسمی عقیدہ تو رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے شعوری طور پر اللہ رب العالمین کو ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے دریافت نہیں کیا۔

اللہ کی دریافت ایک چیز کی دریافت نہیں ہے، بلکہ اللہ کی دریافت تمام چیزوں کی دریافت ہے۔جس آدمی کو اللہ کی دریافت ہوجائے، اس کو زندگی کا سرا مل جائے گا۔وہ زندگی کی حقیقت کو گہرائی کے ساتھ جان لے گا۔اس کو زندگی کے آغاز اور زندگی کے انجام کی معرفت ہوجائے گی۔وہ ہر چیز کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہوجائے گا۔اس کو معرفت کا وہ سرا مل جائے گا، جس کی روشنی میں وہ تمام چیزوں کو ایز اٹ از (as it is) دیکھنے کے قابل ہوجائے گا۔اللہ کی دریافت سے پہلے انسان نہ اپنے آپ کو حقیقی طور پر جانتا ہے، اور نہ بقیہ کائنات کو۔وہ نہ تاریخ کو جانتا

ہے، اور نہ تعبیر تاریخ کو۔

میری ڈسکوری کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ساری دنیا کے مسلمان یہ جانتے ہیں کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو رحمۃ للعالمین (الانبیاء، 21:107) بنا کر بھیجا۔ اس عقیدہ کو لے کر ساری دنیا کے مسلمان رسول اللہ کی نعت خوانی کر رہے ہیں، نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ قرآن میں جس چیز کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے، اس کو تمام دنیا کے مسلمان شخصی منقبت کے معنی میں لیے ہوئے ہیں۔ لیکن قرآن کی اس آیت میں ایک بہت بڑی حقیقت کا اعلان ہے۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے تاریخ میں ایک انقلاب برپا کیا۔ جس کا حوالہ قرآن میں اتمام نور (التوبۃ، 9:32۔ الصّف، 61:8) کے الفاظ میں ملتا ہے۔ یہ اتمام نور کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلام کے ذریعے تاریخ میں ایک عالمی انقلاب برپا کیا جائے گا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں ایک بہت بڑا واقعہ پیش آئے گا۔ وہ ہے آفاق وانفس کی آیات (فصلت، 41:53) کا منکشف کیا جانا۔ اس عمل (process) کے نقطۂ انتہا (culmination) پر وہ عظیم حقائق ظاہر ہوئے جن کو اللہ رب العالمین کی معرفت کا کائناتی خزانہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ انقلاب وہی تھا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس انقلاب کے ذریعے تاریخ میں پہلی بار وہ سائنٹفک فریم ورک انسان کے علم میں آیا، جو اللہ رب العالمین کی اعلیٰ معرفت کا دفتر ہے۔

میں نے اپنے مطالعے کے ذریعے اس حقیقت کو دریافت کیا، اور سائنسی فریم ورک کو استعمال کرتے ہوئے، اللہ رب العالمین کی اعلیٰ معرفت تک پہنچا۔ یہ ربانی معرفت بلاشبہ میرا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اگر میں اس فریم ورک سے بے خبر ہوتا تو شاید میں ایک اندھے بہرے انسان کی حیثیت سے جیتا اور اندھے بہرے انسان کی حیثیت سے مرتا۔ رسول اللہ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک ناقابل بیان پہلو یہ ہے کہ آپ کے ذریعے وہ انقلاب آیا، جس نے اللہ کی اعلیٰ معرفت تک رسائی کو ہر انسان کے لیے ممکن بنا دیا، اور بلاشبہ اللہ کی اعلیٰ معرفت سے زیادہ بڑی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں۔ معرفت صرف ایک چیز نہیں، وہ تمام مطلوب چیزوں کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

دین کے دو درجے

یہود کی تاریخ کے بارے میں ایک آیت قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (62:5)۔ یعنی جن لوگوں کو تورات دی گئی، پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیا ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن کی اس آیت میں کسی امت کے لیے حمل کتاب کے دو درجے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ہے انسانی درجے کا حمل (bearing)، اور دوسرا ہے حیوانی درجہ کا حمل۔ انسانی درجے کا حمل وہ ہے، جب کہ امت اسپرٹ کے اعتبار سے خدا کی کتاب کی حامل ہو۔ یہ اس وقت ہوتا ہے، جب کہ امت ایک زندہ امت کی حیثیت سے باقی ہو۔ اس کے بعد جب امت کی بعد کی نسلوں میں زوال آجائے تو اس وقت امت حمل حیوانی کے درجے میں آجاتی ہے۔ یعنی فارم تو باقی رہتا ہے، لیکن اس کی اسپرٹ غائب ہوجاتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ظاہر میں لوگ سمجھتے ہیں کہ امت دین پر قائم ہے۔ حالاں کہ یہ قائم ہونا ویسا ہی ہے جیسے حیوان کی پیٹھ پر کتاب لاد دی جائے۔

جب کسی امت کا یہ حال ہوجائے تو اس وقت کرنے کا کام یہ نہیں ہوتا کہ فارم کی دھوم مچائی جائے۔ بلکہ اس وقت کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ امت کے اندر دوبارہ اسپرٹ کو زندہ کیا جائے۔ اس کو دوبارہ دین کے معنوی پہلو پر کھڑا کیا جائے۔ کسی امت میں دین کبھی کلی معنوں میں ختم نہیں ہوتا۔ ختم ہونے کا مطلب عملاً یہی ہے کہ امت کے افراد میں دین کا فارم تو بظاہر موجود ہو، مگر دین کی اسپرٹ ان کے اندر سے نکل گئی ہو۔ مثلاً نفرت والا دین تو موجود ہو، لیکن محبت والا دین موجود نہ ہو۔ مبنی بر تشدد دین تو موجود ہو، لیکن مبنی بر امن والا دین غائب ہوگیا ہو۔ مبنی بر قومیت والا دین تو موجود ہو، لیکن مبنی بر دعوت والا دین ان کے اندر پایا نہ جائے، وغیرہ۔

موت کا واقعہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَادِمِ اللَّذَّاتِ، يَعْنِي الْمَوْتَ۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4258)۔ یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ اس کی شرح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ موت دنیا کی لذتوں سے آدمی کو پوری طرح منقطع کر دیتی ہے (فإنه يقطع لذات الدنيا قطعا)۔

اس حدیث میں لذات سے مراد دنیوی تمنائیں (worldly aspirations) ہیں۔ یہاں جس چیز کو ھادم اللذات کہا گیا ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آدمی کے اندر اگر موت کا زندہ شعور ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کی دنیوی وابستگی (worldly attachment) باقی نہ رہے گی۔ وہ موت سے پہلے کی زندگی کے مقابلے میں موت کے بعد کی زندگی کو زیادہ اہم سمجھے گا۔ اس کے بعد اس کی سوچ مکمل طور پر آخرت رخی سوچ (akhirat-oriented thinking) بن جائے گی۔

اس سوچ کا اثر یہ ہوگا کہ آدمی کی امنگیں، آدمی کی دوڑ بھاگ، آدمی کی منصوبہ بندی، سب آخرت رخی ہو جائے گی۔ جو آدمی موت سے غافل ہو، وہ موجودہ دنیا کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے، اس کے ذہن پر موجودہ دنیا کا نقصان اور فائدہ چھایا رہتا ہے۔ وہ ایک دنیا پرست انسان بن جاتا ہے۔ لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا زندہ شعور آدمی کو حاصل ہو جائے تو اس کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب آجائے۔ اب وہ سب سے زیادہ اس دن کے بارے میں سوچے گا، جب کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے (المطففین، 83:6)۔ اب اس کو سب سے زیادہ اس بات کی فکر ہو جائے گی کہ وہ آخرت میں اللہ کی پکڑ سے کس طرح بچ جائے۔ وہ سب سے زیادہ جہنم سے ڈرے گا، اور سب سے زیادہ جنت کا مشتاق بن جائے گا۔ اس کے لذت اور غم کے تصورات بدل جائیں گے۔ اس کے سوچنے کا طریقہ اور اس کا عملی سلوک، ہر چیز میں آخرت کا اثر دکھائی دینے لگے گا۔

امن ایک اقدام

اسلام میں جنگ، دفاع کا معاملہ (issue of defence) ہے۔ اور امن، اقدام کا اشو (issue of advancement) ہے۔ اسلام میں اہل ایمان کو اجازت نہیں کہ وہ اپنی طرف سے جنگ چھیڑیں۔ البتہ جہاں تک امن کا تعلق ہے، اہل ایمان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اسلام کی اشاعت کے لیے پرامن اقدام کا منصوبہ بنائیں۔ اسلام کا یہ اصول فطرت کے قانون پر مبنی ہے۔

فطرت کے قانون کے مطابق، جنگ کے ذریعہ کسی مثبت نتیجہ کا حصول ممکن نہیں۔ کیوں کہ جنگ سے کسی بات کا فیصلہ نہیں ہوتا، نہ ہارنے کی صورت میں اور نہ جیتنے کی صورت میں۔ جنگ میں اگر فتح حاصل ہو، تب بھی ہارنے والے فریق کے دل میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس لیے جنگ میں فتح بھی ایک نئی جنگ کا آغاز بن جاتا ہے۔

پرامن منصوبہ بندی ہمیشہ اپنا کام کرتی ہے، پرامن منصوبہ بندی کوئی نیا مسئلہ پیدا نہیں کرتی۔ وہ صرف مسئلہ کے حل کی طرف لے جاتی ہے۔ پرامن منصوبہ بندی کے تحت اقدام کرنا، ایک ایسے انجام کی طرف لے جاتا ہے جہاں جنگ کا خاتمہ ہوجائے اور لوگوں کو پرامن سرگرمیوں کے لیے مواقع (opportunities) حاصل ہوجائیں۔ اسلام کے دورِ اول کی تاریخ اس اصول کی تصدیق کرتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اہل ایمان اور ان کے مخالفین کے درمیان کچھ لڑائیاں ہوئیں۔ مثلاً غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ حنین، وغیرہ۔ مگر ان لڑائیوں سے ٹکراؤ ختم نہیں ہوا۔

ٹکراؤ کا خاتمہ اس وقت ہوا، جب آپ نے یک طرفہ طور پر صلح کی۔ قرآن میں فتح کی آیت صرف صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی۔ اس آیت میں فتح کا مطلب ہے ٹکراؤ کا خاتمہ اور پرامن سرگرمیوں کے لیے موافق ماحول پیدا ہوجانا۔ کسی اور غزوہ کے بعد فتح کی آیت نہیں اتری۔ حدیبیہ کا واقعہ 6 ہجری میں پیش آیا۔ اس موقع پر فریق ثانی کی کوشش صرف یہ تھی کہ رسول اور اصحابِ رسول مکہ میں داخل نہ ہوں، اور عمرہ کیے بغیر واپس مدینہ چلے جائیں۔ مگر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خود

اپنی طرف سے امن کی بات چیت (peace negotiation) شروع کی۔ اس معاملہ میں آپ اس آخری حد تک گیے کہ فریق ثانی کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر منظور کرلیا۔ صرف اس مقصد کے لیے کہ دونوں فریقوں کے درمیان صلح ہوجائے اور معتدل حالات قائم ہوجائیں۔ تاکہ کھلے طور پر اسلام کے دعوتی مشن کو جاری کیا جاسکے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس طرح فریقِ ثانی سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کرلی تو اس کے بعد قرآن کی سورہ نمبر 48 نازل ہوئی۔ اس میں پیشگی طور پر یہ اعلان کردیا گیا کہ یہ پرامن مصالحت باعتبارِ نتیجہ ایک فتح مبین (clear victory) ہے۔ قرآن کی یہ پیشگی خبر صرف چند سالوں میں واقعہ بن گئی، پرامن اقدام باعتبارِ نتیجہ فتح ثابت ہوا۔

اسلام میں جنگ مجبوری کے تحت وقتی دفاع کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، پرامن منصوبہ اس لیے ہوتا ہے کہ سماج کے اندر مستقل طور پر اعتدال کی حالت قائم ہوجائے۔ ہر فرد کے لیے تعمیری سرگرمیوں کے مواقع حاصل ہوجائیں۔

☆☆☆☆☆

بعد کے دور کے مسلم علماء نے جو باتیں کہی ہیں، ان کی ایک قسم وہ ہے جو نص قطعی پر مبنی ہو۔ کوئی عالم جب ایک ایسی بات کہے جو قرآن وحدیث کے ثابت شدہ حوالوں پر مبنی ہو تو ایسی رائے پر کسی کو تنقید کا حق نہیں۔ مثلاً ایک عالم اگر یہ کہتا ہے کہ نماز اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رُکن ہے تو اس پر کوئی شخص تنقید کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ کیوں کہ یہ رائے ایک معلوم نص پر مبنی ہے۔ رائے کی دوسری قسم وہ ہے جو قرآن و حدیث پر اضافہ کے ہم معنیٰ ہو۔ مثلاً دار الکفر، دار الحرب اور دار الاسلام کی اصطلاحیں مقرر کرنا۔ ایسی رائے شرعی اصطلاح کے مطابق ایک اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے بارے میں شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ مجتہد کا اجتہاد صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔

محبت انسانی

محبت انسانی کے بارے میں ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 13875)۔ یعنی تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ وہ دوسروں کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ اس بات کو فارسی شاعر شیخ سعدی (691-585ھ) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ہر چہ بر خود مہ پسندی، بر دیگراں مہ پسند (جو چیز تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اس کو تم دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو)۔

ہر انسان سے محبت کرنا، محض ایک سماجی یا اخلاقی تقاضہ نہیں ہے، بلکہ وہ خود اپنی شخصیت کے ارتقا کی بات ہے۔ یہ انسان کا خود اپنا انٹرسٹ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔ جو آدمی ایسا نہ کرے، وہ اپنے آپ کو جنت میں داخلے کے لیے غیر مستحق ثابت کر رہا ہے۔ قرآن میں جنت کے بارے میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا (56:25-26)۔ یعنی اس میں وہ کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ مگر صرف سلام سلام کا بول۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنت کی سوسائٹی ایک ایسی سوسائٹی ہوگی، جہاں ہر آدمی کے دل میں دوسرے کے لیے سلامتی ہوگی، جہاں ہر آدمی اعلیٰ اخلاق کی پابندی کرنے والا ہوگا، جہاں کوئی شخص ایسا کام نہیں کرے گا جس سے اس کے پڑوسی کو ذرا بھی کوئی تکلیف پہنچے۔ جنت ایسے انسانوں کا معاشرہ ہوگا، جہاں ہر شخص دوسرے انسان کا کامل معنوں میں دوست اور خیر خواہ ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کا عقیدہ ہر انسان کے لیے حسن اخلاق کو اس کے ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ بنا دیتا ہے۔ ہر آدمی اخلاق کے معاملے میں حد درجہ حساس ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ اگر وہ اخلاق کے معاملے میں اعلیٰ معیار پر قائم نہ ہو تو وہ قانون قدرت کے مطابق، جنت میں داخلے کے لیے نااہل ہوجائے گا۔ جنت کو ماننے والا کوئی شخص اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ اخلاق کے اعلیٰ معیار پر پورا نہ اترے۔

عذاب سے نجات

قرآن میں بنی اسرائیل (یہود) کے حوالے سے ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (2:49)۔ یعنی اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی۔ وہ تم کو بڑی تکلیف دیتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے۔ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بھاری آزمائش تھی۔

یہ اس واقعہ کا ذکر ہے، جب کہ قدیم مصر میں یہود کو فرعون جیسے ظالم بادشاہ کے ظلم کا سامنا تھا، اور پھر اللہ نے اس سے نجات دی۔ موجودہ زمانے میں نجات کا یہی واقعہ امت مسلمہ کے ساتھ پیش آیا۔ یہود کے ساتھ قدیم عذاب دراصل مذہبی تعذیب (religious persecution) کا واقعہ تھا۔ موجودہ زمانے میں امت مسلمہ کے ساتھ بھی زمانی فرق کے ساتھ اسی قسم کا تجربہ پیش آیا۔ یہ تجربہ زیادہ تر سیاسی جبر (political persecution) کی بنا پر تھا۔ اللہ تعالی نے ایسے حالات پیدا کیے کہ دنیا سے سیاسی جبر کا نظام ختم ہو گیا، اور آزادانہ جمہوریت کا نظام ساری دنیا میں قائم ہو گیا۔ 1945 میں اقوام متحدہ (UNO) قائم ہوئی، اور دنیا کی تمام قوموں کے اتفاق سے یہ طے ہوا کہ اب کسی بھی شخص یا گروہ پر مذہب کی بنیاد پر کسی بھی قسم کا جبر یا تشدد نہیں کیا جائے گا۔

اب دنیا کامل مذہبی آزادی کے دور میں ہے۔ اب اگر کسی گروہ کو جبر یا تشدد کا سامنا پیش آئے تو وہ خود اس کی اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کی بنا پر ہوگا۔ وہ اس لیے ہوگا کہ لوگوں نے ''آ بیل مجھے مار'' کی سیاست اختیار کی۔ موجودہ زمانے میں اگر کوئی شخص یا گروہ حقیقی معنوں میں پر امن طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے اپنا کام کرتا ہے تو اس کو ہرگز کسی سے کسی قسم کے جبر یا تشدد کا سامنا پیش نہیں آئے گا۔ قدیم زمانے میں یہود کو ظلم سے جو ''نجات'' ملی تھی، موجودہ زمانے میں اس سے بہت زیادہ بڑی ''نجات'' اہل اسلام کو مل چکی ہے۔ اب ان کے لیے شکر کا موقعہ ہے، نہ کہ شکایت کا موقعہ۔

انبیاء کا نمونہ

قرآن میں انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے یہ آیت آئی ہے: إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (38:46)۔ یعنی ہم نے ان پیغمبروں کو ایک خاص مشن، آخرت کی یاد دہانی کے لیے چن لیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کے لیے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ مشن کیا ہے۔ پیغمبر کی امت کو بھی ہر زمانے میں اسی مشن کی پیروی کرنا چاہیے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کا مشن آخرت کا مشن تھا۔ مگر یہ مشن اتفاقاً نہیں بنتا۔ اس کے لیے پیغمبروں کو تیار کیا جاتا ہے۔ وہ اپنا مشن شروع کرنے سے پہلے غور وفکر کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ انسان کے خالق نے ان کو کس منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے۔ غور وفکر کی اس زندگی کے بعد انھیں اللہ کی طرف سے ہدایت ملتی ہے۔ اور پھر وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ انسان کی زندگی آخرت رخی (akhirat-oriented life) ہو، انسان کی سوچ کا مرکز ومحور آخرت ہو، وہ اپنی زندگی اس سوچ کے تحت گزارے کہ دنیا میں ان کی جو شخصیت بنے، وہ آخرت کے اعتبار سے ایک کامیاب شخصیت ہو۔

پیغمبر اس لیے نہیں آتا کہ وہ ملی ورک یا سوشل ورک جیسے کام کرے یا کوئی سیاسی پروگرام چلائے۔ پیغمبر کا مشن یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو زندگی کے اصل مقصد سے آگاہ کرے، وہ لوگوں کو بتائے کہ خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق، ان کے لیے کامیابی کیا ہے اور ناکامی کیا۔ وہ دنیا میں کس طرح زندگی گزاریں کہ موت کے بعد جب وہ آخرت کی دنیا میں پہنچیں تو وہ اللہ کے انعام کے مستحق قرار پائیں۔ اللہ کی طرف سے پیغمبروں کو یہ حکم ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی جھکاؤ (tilt) کا ثبوت نہ دیں، وہ کسی سمجھوتے کے بغیر خدا کا اصل پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔ اس معاملے میں وہ کسی بھی عذر کو استعمال نہ کریں۔

دعوت حق کا استقبال

عام طور پر یہ خیال ہے کہ اسلام کی دعوت کا کام اگر کیا جائے تو اس کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے یا مخاطبین کی طرف سے داعی کو پتھر مارا جائے۔ اگر داعی کا استقبال پتھر سے نہ کیا جائے تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ دعوت، انبیاء کے نہج پر نہیں ہے۔ وہ پیغمبرانہ دعوت نہیں ہے، بلکہ کوئی اور دعوت ہے۔ اس سوچ کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ بلکہ جو دلیل موجود ہے، وہ اس کے خلاف شہادت دیتی ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اور اصحاب رسول نے اپنے زمانے میں اللہ تعالی سے یہ دعا کی: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا (2:286)۔ یعنی اے ہمارے رب، ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا بوجھ تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بعد کے دور میں دعوتِ دین کے کام کے لیے اللہ کی طرف سے تسہیل کا معاملہ کیا جائے گا، جو پچھلے ادوار میں سخت مشکل کام بنا ہوا تھا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3612)۔ اسی چیز کو ایک آیت میں ختم فتنہ کا زمانہ بتایا گیا ہے (البقرۃ، 2:193)۔ قرآن وحدیث کے بیانات کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ بات عقیدہ کے درجے میں ثابت شدہ بن جاتی ہے کہ قدیم زمانہ اگر تعسیر دعوت کا دور تھا، تو بعد کا زمانہ تیسیر دعوت کا دور ہوگا۔ اس حقیقت کو نہ ماننا قرآن وحدیث کے نصوص کو نہ ماننے کے برابر ہے۔

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تیسیر کا یہ معاملہ مطلق معنی میں پایا جائے گا، یعنی وہ داعیوں کو خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ بلکہ یہ ایک موقع (opportunity) کا معاملہ ہوگا۔ یعنی داعی اگر اس کو جانے، اور اس کے مطابق دانش مندانہ انداز میں اپنا دعوتی عمل جاری کرے تو اس کو اس تبدیلی کا فائدہ حاصل ہوگا، ورنہ نہیں۔ اس فائدہ کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ داعی اپنا کام غیر نزاعی انداز میں کرے۔ اگر اس نے اتھاریٹی سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا، تو اس کو ٹکراؤ کے جواب میں ٹکراؤ ملے گا۔

عظمت رفتہ کی بازیابی

عظمت رفتہ کی بازیابی موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا ایک محبوب موضوع ہے۔ عظمت رفتہ کی بازیابی کا مطلب ہے امت مسلمہ کے سیاسی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا، یا اگر سیاسی اصطلاح سے اعراض کیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ملت کی تہذیبی عظمت کی بازیافت۔ سو سال سے بھی زیادہ مدت سے تقریبا تمام مسلم رہنما اس کو اپنا محبوب مقصد بنائے ہوئے ہیں، خواہ وہ عرب رہنما ہوں یا غیر عرب رہنما۔ ان حضرات کی تحریر وتقریر سے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ قرآن یا حدیث کے کس حوالے سے انھوں نے یہ نشانہ اخذ کیا ہے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملہ میں کوئی بھی حقیقی حوالہ ان کے پاس موجود نہیں۔ یہ مسلمانوں کے قومی جذبات کی ترجمانی ہوسکتی ہے، لیکن وہ قرآن وحدیث سے اخذ کردہ کوئی ثابت شدہ مقصد نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن وسنت کے مطابق، عظمت رفتہ کی واپسی کوئی مقصد نہیں بن سکتا۔ اس نشانے کو اگر مادی معنی میں لیا جائے تو وہ ایک بے معنی اصطلاح ہوگی۔ کیوں کہ مادی ترقی کے اعتبار سے زندگی ہمیشہ آگے بڑھتی ہے، وہ کبھی پیچھے کی طرف سفر نہیں کرتی۔ اس لیے مادی اعتبار سے اگر ملت کی منزل متعین کی جائے تو وہ یہ ہونا چاہیے کہ جدید تہذیب میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کو دور کیا جائے، اور مسلمانوں کو جدید معنی میں تعلیم وترقی کے درجے تک پہنچایا جائے۔

اور اگر واپسی کے اس نشانے کو قرآن وحدیث کے معنی میں لیا جائے تو اس کو امام مالک کے استاذ، صالح بن کیسان کے الفاظ کے مطابق ہونا چاہیے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: لا يُصْلِحُ آخِرَ هَذِهِ الأُمَّةِ إِلا مَا أَصْلَحَ أَوَّلَهَا (مسند الموطا للجوہری، اثر نمبر 783)۔ یعنی اس امت کے آخر کی اصلاح اسی طرح ہوسکتی ہے، جس طرح اس کے پہلے کی ہوئی۔ اس اعتبار سے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے درمیان کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کے اندر دعوت کا شعور پیدا کیا جائے، ان کو دور اول کے اہل ایمان کی طرح دعوت الی اللہ کے نشانے پر کھڑا کیا جائے۔

فضیلتِ رسول

قرآن کے ایک مقام پر اٹھارہ نبیوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ہر ایک کے لیے یہ آیت آئی ہے: وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ (6:86)۔ اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ فضیلت کا لفظ ایک ترجیحی لفظ (preferential term) ہے۔ یعنی دوسرے تمام لوگوں پر کسی ایک کو افضلیت کا درجہ دینا۔ اٹھارہ لوگوں کو بیک وقت افضل بنانا، افضلیت کے معروف مفہوم کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ معروف مفہوم کے مطابق افضل کوئی ایک شخص ہوتا ہے، نہ کہ بہت سے لوگ۔

یہاں فضیلت کا مطلب کیا ہے۔ یہ قرآن کی ایک اور آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ایک مقام پر مختلف پھلوں کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ (13:4)۔ یعنی اور ہم بعض کو بعض پر مزے میں فضیلت دیتے ہیں۔

پھلوں میں فضیلت کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی ایک پھل دوسرے پھلوں سے علی الاطلاق طور پر افضل ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر پھل میں دوسرے پھل کے مقابلے میں ایک اضافی خصوصیت (additional quality) ہوتی ہے۔ کسی میں ایک مزہ ہے، اور کسی میں دوسرا مزہ۔ کوئی خالص میٹھا ہے، اور کوئی ترشی آمیز میٹھا۔ کوئی کم میٹھا ہے اور کوئی زیادہ میٹھا، کسی میں ایک غذائی فائدہ ہے، اور کسی میں دوسرا غذائی فائدہ، وغیرہ۔

یہی معاملہ مختلف نبیوں کے ساتھ تھا۔ ہر نبی مختلف قوموں میں اور مختلف حالات میں آئے۔ ہر نبی کو ان کے مقامی حالات کے اعتبار سے کوئی اضافی خصوصیت دی گئی۔ مثلاً حضرت موسیٰ کو عصا کا معجزہ، اور حضرت مسیح کو شفائے امراض کا معجزہ، وغیرہ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے نبی بنا کر بھیجے گیے۔ اس لیے آپ کو کوئی وقتی معجزہ نہیں دیا گیا، بلکہ ایسا معجزہ دیا گیا جو قیامت تک باقی رہے، اور وہ قرآن تھا۔ قرآن کا معجز کلام ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ایک حجت ہے۔

دین اکابر

دور زوال میں کسی امت کا حال کیا ہوتا ہے، اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اتخذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (9:31)۔ یعنی انھوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنالیا۔ احبار و رہبان کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اکابر کو اتنا بڑا درجہ دیا کہ عملاً وہی لوگ ان کے لیے دین کا ماخذ بن گئے۔ یہاں تک کہ لوگ عملاً دین خداوندی کے بجائے دین اکابر پر قائم ہو گئے۔

کسی امت کی یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب کہ اللہ رب العالمین کے بارے میں ان کا عقیدہ محض رسمی عقیدہ بن جائے، وہ زندہ عقیدہ کی حیثیت سے ان کے درمیان باقی نہ رہے۔ اس وقت ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مفروضہ اکابر کو بڑے بڑے القاب دینے لگتے ہیں۔ مثلاً امام، شیخ الاسلام، مجدد کامل، فقیہ الامت، حکیم الامت، حکیم الاسلام، امام اعظم، وغیرہ۔ اس طرح کے بڑے بڑے القاب دینے کی بنا پر ان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ علم کے بارے میں یہ لوگ آخری شخص بن گئے۔ تجدید اور اجتہاد کا عمل ان کے اوپر ختم ہو گیا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو وہ اپنے بڑوں کو پیغمبر تو نہیں کہتے، لیکن عملاً وہ ان کو دین میں پیغمبر جیسا درجہ دے دیتے ہیں۔

یہ تنزل کا آخری درجہ ہے۔ جب امت میں یہ درجہ آتا ہے تو امت کے اندر تخلیقی سوچ (creative thinking) ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اجتہادی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ تقلید کو دین سمجھ لیتے ہیں، اور اجتہاد کو بے دینی۔ ان کی سوچ کی آخری حد یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مفروضہ اکابر کے ملفوظات کو دہراتے رہیں۔ وہ اپنے بڑوں کی رایوں کو تفقہ کا اعلیٰ درجہ سمجھ لیتے ہیں۔ زوال کے اس حد پر پہنچنے کے بعد ان کا وہی درجہ ہو جاتا ہے، جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لهمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلهمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلهمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (7:179)۔

جذباتی اشو

سرحد پار سے آنے والی خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں جو انتہا پسند گروپ ہیں، وہ اب وہاں کی حکومت کے لیے غیر مطلوب (unwanted) بن چکے ہیں۔ حکومت کے ذمہ دار اس کا اعتراف یہ کہہ کر کررہے ہیں کہ وہ ہمارے لیے مسئلہ (problem) بن گیے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حکومت ان کے خلاف فوری طور پر کوئی سخت اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ کیوں ہوگیا ہے کہ حکومتی ذمہ دار وہاں کی انتہا پسند تنظیموں سے اختلاف کرتے ہوئے بھی ان کے خلاف کوئی ایکشن لینے میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ اس معاملے میں غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ جن مسائل (issues) کو لے کر پڑوسی ملک میں انتہا پسند تحریکیں اٹھیں، ان کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پاکستان کے لوگوں کے لیے جذباتی اشو بن گیا۔ یہی اس معاملے میں اصل غلطی تھی۔ اجتماعی مسائل میں بے حد ضروری ہے کہ ان کو سنسٹائز (sensitize) نہ کیا جائے، یعنی ان کو جذباتی اشو نہ بنایا جائے۔

کسی اجتماعی مسئلے کو ہمیشہ معتدل حد میں باقی رکھنا چاہیے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قوموں کے اجتماعی مسائل مقدس عقیدے کی مانند نہیں ہوتے۔ اس طرح کے مسائل میں ہمیشہ ری تھنکنگ، ری پلاننگ، یوٹرن پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی مسئلے کو سنسٹائز کرکے اس کو ایک جذباتی اشو بنا دیا جائے تو اس معاملے میں کوئی نیا موقف (stand) لینا ناممکن ہوجاتا ہے۔ کوئی جذباتی مسئلہ جب تک اعتدال کے دائرے میں ہو، وہ رہنماؤں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ بڑھ کر ایک جذباتی اشو بن جائے تو رہنما پیچھے ہوجاتے ہیں، اور عوام آگے ہوجاتے ہے۔ اب رہنماؤں کے لیے کوئی نیا موقف اختیار کرنا عملاً ناممکن ہوجاتا ہے۔

عہدِ شباب

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری میں اس کا ابتدائی جزء یہ ہے: يَأْتِي فِي آخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ، حُدَثَاءُ الأَسْنَانِ، سُفَهَاءُ الأَحْلاَمِ، يَقُولُونَ مِنْ خَيْرِ قَوْلِ البَرِيَّةِ، يَمْرُقُونَ مِنَ الإِسْلاَمِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3611)۔

اس حدیث میں ایک ظاہرے کی طرف اشارہ ہے، جس کی ایک انتہائی صورت کو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس سے قطع نظر اس حدیث سے فطرت کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی آدمی جب اپنے عہدِ شباب (youth age) میں ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنی عقل وفہم کے اعتبار سے غیر پختہ (immature) ہوتا ہے۔ اس لیے کسی آدمی کی اس رائے کو زیادہ قابلِ اعتبار سمجھنا چاہیے جس کو اس نے پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد ظاہر کی ہو۔

قرآن سے بھی فطرت کا یہ اصول معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ جب جوانی کی عمر میں تھے۔ اس وقت انھوں نے مصر کے ایک قبطی کو گھونسا مار دیا، جس سے وہ مر گیا (القصص، 28:15)۔ لیکن حضرت موسیٰ کو عہدِ شباب میں نبوت نہیں دی گئی۔ بلکہ اس وقت دی گئی جب کہ وہ پختگی کی عمر (age of maturity) تک پہنچ چکے تھے۔ کیوں کہ بحیثیت پیغمبر ان کو قولِ لیِّن (طٰہٰ، 20:44) کی زبان میں کلام کرنا تھا۔

مذکورہ حدیث میں مسلم تاریخ کے ایک اہم پہلو کی توجیہہ ملتی ہے۔ مسلم تاریخ اپنے بعد کے زمانے میں نظریاتی انتہاپسندی (ideological extremism) کی طرف چلنے لگی۔ اس کو حدیث میں انتباہ کی زبان میں غلو (ابن ماجہ، حدیث نمبر 3029) کہا گیا ہے۔ حدیث کے مطالعے سے مذکورہ تاریخی ظاہرہ کی نفسیاتی توجیہہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعد کے زمانے میں جن افراد کو مسلمانوں کے اندر مفکر (thinker) کا درجہ ملا، ان کی فکر ان کے عہدِ شباب میں تشکیل پائی تھی، جب کہ وہ پختگی کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ مثلاً ابن تیمیہ، عبدالوہاب نجدی، ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ۔

عہد شباب میں انسان کے اندر جوش کا جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس کے افکار میں اکثر انتہاپسندی کا انداز پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ اعتدال کی زبان بولنے کے بجائے، انتہاپسندی کی زبان بولنے لگتا ہے۔ بعد کو اس کی یہ فکر مقدس بن کر لوگوں میں اتنی پھیل جاتی ہے کہ لوگ اس کو نظر ثانی کے بغیر درست فکر سمجھ لیتے ہیں۔ یہی واقعہ بعد کے زمانے کے مسلم مفکرین کے ساتھ پیش آیا۔

مثلاً ابن تیمیہ کے زمانے میں یہ خبر پھیلی کہ ایک عیسائی نے پیغمبر اسلام کے بارے میں کوئی بات کہی ہے، جس کو اس وقت کے مسلمانوں نے شتم رسول کا کیس قرار دیا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ ابن تیمیہ اپنی جوانی کی عمر میں تھے۔ اس وقت انھوں نے عربی میں ایک ضخیم کتاب لکھی: الصارم المسلول علی شاتم الرسول۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ جو آدمی شتم رسول کا مرتکب ہو، اس کی سزا قتل ہے۔ ابن تیمیہ اس وقت اگر پختگی کی عمر میں ہوتے تو یقیناً ان کا ردعمل مختلف ہوتا۔ وہ مذکورہ عیسائی سے مل کر اس کو ہمدردانہ انداز میں سمجھاتے۔ وہ ایک ایسی کتاب لکھتے جس میں وہ بتاتے کہ شتم رسول جیسا غیر فطری معاملہ ہمیشہ غلط فہمی کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے آدمی کے اوپر تبلیغ کرنا چاہیے، اور پرامن دعوتی عمل کے ذریعے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیے۔

سید ابوالاعلی مودودی کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا، اس کے بعد انھوں نے اپنی اردو کتاب الجہاد فی الاسلام لکھی۔ اس وقت وہ اپنی جوانی کی عمر میں تھے۔ چناں چہ انھوں نے جوش و خروش کے انداز میں ایک ایسی کتاب لکھی جس میں جہاد بمعنی قتال کی زبردست وکالت کی گئی تھی۔ حالاں کہ اگر وہ اس وقت پختگی کی عمر میں ہوتے تو شاید وہ ایک اور کتاب لکھتے جس کا عنوان یہ ہوتا، الدعوۃ الی اللہ۔ اس کتاب میں وہ پرامن دعوت کی اہمیت بتاتے اور مسلمانوں کو راغب کرتے کہ وہ پرامن دعوت کے اصول پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ یہی معاملہ دوسرے مسلم مفکرین کے ساتھ پیش آیا۔ اب اس کا حل یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے براہ راست طور پر قرآن وسنت کا مطالعہ کیا جائے، نہ کہ بعد کے زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں کا۔

طالب علمی کا دور

طالب علمی کا دور نوجوانی کا دور ہوتا ہے۔ نوجوانی کے دور میں آدمی ایک غیر پختہ انسان ہوتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ایک چیز اور دوسری چیز میں فرق کرے۔ وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ جذباتی بات اور دانش مندانہ بات کے درمیان تجزیہ کر سکے۔ وہ لفظی نعرہ اور دانشمندانہ قول کو الگ الگ کر کے دیکھے۔ وہ نتیجہ خیز اقدام اور غیر نتیجہ خیز اقدام کے درمیان فرق کو سمجھے۔ یہ فرق خود فطرت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ پختگی (maturity) کا تعلق عمر سے ہے۔ جب تک آدمی ایک خاص عمر تک نہ پہنچے، اس کا شعور ایک پختہ شعور نہیں ہوسکتا۔ اس لیے طالب علموں کی تنظیم بنا کر ان کو مظاہراتی سرگرمیوں میں لگانا کوئی کام نہیں۔ اس قسم کی سرگرمی طالب علموں کے ڈی ریلمنٹ (derailment) کے ہم معنی ہے۔ اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ طالب علموں کے ساتھ دشمنی ہے، نہ کہ دوستی۔

طالب علموں کے لیے صحیح ترین مشغلہ یہ ہے کہ وہ پڑھیں، اور پڑھیں، اور پڑھیں۔ وہ تعلیم کے ختم تک اپنی ذہنی ارتقا (intellectual development) کے سوا کسی اور چیز کو اپنا فوکس نہ بنائیں۔ مثلاً طالب علمی کے دوران وہ کالج اور یونیورسٹی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت لائبریری کو دیں۔ وہ کلاس کے بعد کا وقت کتابوں کے مطالعے میں لگائیں۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ طالب علمی کے زمانے میں وہ صرف اپنے تعلیمی مستقبل کو فوکس کریں۔ کسی اور چیز پر صرف اس وقت فوکس کریں، جب کہ تعلیم کا زمانہ ختم ہو چکا ہو۔

موجودہ زمانے میں اقتصادیات تعلیم کا ایک جزء بن گیا ہے۔ مگر طالب علم کو چاہیے کہ اس کو وہ صرف ضرورت کے خانے میں رکھے۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے تعلیم برائے تعلیم (education for the sake of education) کا فارمولہ اختیار کرے۔ یاد رکھیے موجودہ زمانہ اختصاص کا زمانہ ہے۔ اگر آپ کسی فن میں مہارت رکھتے ہوں تو آپ کی قیمت ہے، اور اگر آپ مہارت نہ رکھتے ہوں تو آپ کی قیمت عملی زندگی میں بہت زیادہ گھٹ جائے گی۔

مشتبہ اظہار رائے

کچھ لوگوں کا طریقہ ہے کہ وہ کسی کے بارے میں کھل کر رائے نہیں دیتے، البتہ وہ اس کے بارے میں مشتبہ اظہار رائے (doubtful comment) دیتے ہیں۔ اس معاملے کی ایک مثال وہ ہے جو 6ھ کے آخر میں پیش آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومن ایمپائر کے بادشاہ ہرقل کو دعوتی مکتوب بھیجا۔ اس وقت ہرقل (Hercules) فلسطین میں موجود تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں تفصیلی روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس مکتوب کے ملتے ہی ہرقل نے ابوسفیان کو بلایا جو کہ تجارتی سفر کے سلسلے میں اس وقت فلسطین میں موجود تھے۔ ان سے ہرقل کے جو سوالات اور جوابات ہوئے ان میں سے ایک یہ تھا: قَالَ: فَهَلْ يَغْدِرُ؟ قُلْتُ: لاَ، وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لاَ نَدْرِي مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7)۔ ہرقل نے پوچھا، کیا وہ وعدہ خلافی کرتا ہے، ابوسفیان نے کہا: نہیں، اور ہم اس سے ابھی ایک معاہدہ کی مدت میں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم وہ اس میں کیا کرے گا۔

اس واقعے میں ابوسفیان، جو اس وقت اسلام نہیں لائے تھے۔ ان کو صرف یہ کہنا تھا کہ نہیں۔ مگر اس کے بعد انھوں نے اپنے جواب میں جو بات (وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لاَ نَدْرِي مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيهَا) کہی۔ یہ رسول اللہ کے کردار کے بارے میں ایک مشتبہ بیان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کا مشتبہ بیان اسلامی تعلیمات کے مطابق جائز نہیں۔

اعلیٰ انسانی اخلاق یہ ہے کہ آدمی وہ بات کہے جو عملاً واقعہ بن چکا ہو۔ جو بات واقعہ نہیں بنی، اس کو بیان کرنا زیر بحث شخصیت کے کردار کو مشتبہ بنانے کے ہم معنی ہے۔ یہ طریقہ بلاشبہ درست طریقہ نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ خیر (ثابت شدہ) بات بولے، ورنہ چپ رہے: وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَاليَوْمِ الآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6018)۔ یعنی جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ خیر کی بات کہے، یا چپ رہے۔

حالاتِ حاضرہ

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص اگر حالات حاضرہ کے موضوع پر کلام کرتا ہے تو تقریبا ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ منفی انداز میں کلام کرتا ہے، وہ حالات حاضرہ پر منفی تنقید کرتا ہے، وہ حالات حاضرہ میں ظلم کی نشاندہی کرتا ہے، اور بطور خود کسی کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور پھر اس کے خلاف بولنا اور لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ تقریر کا بھی ہے اور تحریر کا بھی۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب چیزوں کے بارے میں غلط معیار سے سوچنا ہے۔ مقررین یا محررین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کے مطابق، چیزوں کو جانچنے کا ایک معیار (yardstick) بنا لیتے ہیں۔ یہ معیار ہمیشہ آئڈیل پر مبنی ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے اس آئڈیل معیار پر چیزوں کو جانچتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ہر چیز ان کی معیار سے کم ہے۔ اس ذاتی تجربے کی بنا پر وہ منفی بن جاتے ہیں، اور چیزوں کے بارے میں منفی رائے دینا شروع کر دیتے ہیں۔ بطور خود وہ اس کو تنقید (criticism) سمجھتے ہیں۔ یہ رواج ہمیشہ خود ناقد کی غلط فکری پر مبنی ہوتا ہے۔ اجتماعی حالات کبھی آئڈیل نہیں ہو سکتے۔ چوں کہ ہر آدمی کو آزادی ملی ہوئی ہے، اس لیے ہر آدمی اپنی آزادی کو اپنی سوچ کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ آزادی کا یہ استعمال دوسروں کی سوچ سے ٹکراتا ہے۔ جب ہر آدمی اپنی آزادی پر چلے تو لازماً ایسا ہوگا کہ ایک صورت حال جو ایک شخص کو درست معلوم ہو، وہ دوسرے کو غلط نظر آئے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ اس نظام کے سوا کوئی اور نظام اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ آئڈیلسٹ (idealist) نہ بنیں، بلکہ وہ پریگمیٹک (pragmatic) بنیں۔ وہ یہ نہ دیکھیں کہ کیا ہونا چاہیے، بلکہ وہ یہ دیکھیں کہ عملاً کیا ہو سکتا ہے۔ مذکورہ رواج کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ ہر آدمی منفی سوچ میں مبتلا ہے۔ ہر آدمی دوسروں کے خلاف شکایت لیے ہوئے ہے۔ لیکن اگر لوگ حقیقت پسند بنیں، اور چیزوں کو آئڈیل معیار پر نہ جانچیں، بلکہ پریگمیٹک معیار پر جانچیں تو اس منفی صورتِ حال کا خاتمہ ہو جائے گا۔

دشمن میں دوست

جس کو آپ دشمن سمجھتے ہیں، وہ آپ کا سب سے بڑا دوست ہے۔ آپ کا مفروضہ دشمن آپ کی فکر کو بیدار کرتا ہے۔ وہ شاک (shock) کے ذریعہ آپ کے ذہن کی بند کھڑکیوں کو کھولتا ہے۔ وہ آپ کو نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ آپ کو نان کریٹیو مائنڈ سے ترقی دے کر کریٹیو مائنڈ بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا دشمن آپ کا بے رحم ناقد ہے، اور بے رحم ناقد سے زیادہ اچھا مشیر (adviser) اور کوئی نہیں۔

میں ایک مرتبہ ایک شہر میں گیا۔ وہاں مجھے مقامی زو (zoo) دکھایا گیا۔ اس زو میں ایک انکلوزر (enclosure) تھا۔ اس انکلوزر میں بہت سے ہرن بیٹھے ہوئے تھے۔ زو کے ڈائریکٹر نے بتایا کہ یہ ہرن یہاں کے پرامن ماحول میں رہتے رہتے ڈل (dull) ہوجاتے ہیں، ان کی فرٹیلیٹی (fertility) کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے ہم کبھی کبھی ان کے درمیان بھیڑیا ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ ہرن ان کے خوف سے دوڑیں، اور اس طرح ان کی فرٹیلیٹی کی صلاحیت بیدار ہو۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان بھی اگر آسودگی میں رہے تو اس کا ذہن ڈل ہوجائے گا۔ یہ اللہ تعالی کی حکمت کا معاملہ ہے کہ انسان کے معاشرے میں ان کے حریف (rival) موجود ہوں۔ تاکہ انسان کا ذہن برابر بیدار رہے، وہ کبھی ڈل (dull) نہ ہونے پائے۔ انسان کی ترقی کے لیے چیلنج (challenge) بہت ضروری ہے۔ چیلنج کی حیثیت شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) کی ہوتی ہے۔ چیلنج ایک رحمت کا معاملہ ہے۔ چیلنج سے سوئے ہوئے انسان جاگتے ہیں۔ چیلنج آدمی کو مین (man) سے ترقی دے کر سوپر مین (superman) بنا دیتا ہے۔

انسان کے اندر بے شمار صلاحیتیں ہیں۔ لیکن یہ صلاحیتیں خوابیدہ (dormant) حالت میں ہیں۔ ان صلاحیتوں کو جگانے کے لیے ''دشمن'' درکار ہوتے ہیں۔ دشمن آپ کا سب سے بڑا دوست ہے۔ دشمن آپ کے لیے زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کی حیثیت رکھتا ہے۔

- **متلاشی حق انسان:** اورنگ آباد سی پی ایس ممبر عبد السمیع صدیقی (فون:9766663559) 13 مارچ 2018 کو اپنے آفس کے سینئر ساتھی کو ترجمہ قرآن دینے ان کے فلیٹ پر گئے۔ واپسی کے وقت ایک ہندی ترجمہ قرآن ان کے ہاتھ میں تھا۔ راستے میں ایک خاتون، کلپنا چھترے نے ان سے پوچھا: بھیا، یہ قرآن سیل (sale) کرنے کے لیے ہے؟ کیوں کہ میری خواہش ہے کہ اگر میری بھاشا میں قرآن مل جائے تو میں قرآن کو پڑھوں۔ مسٹر عبد السمیع نے جواب دیا کہ یہ سیل (sale) کرنے کے لیے نہیں ہے، لیکن آپ پسند کریں تو یہ آپ کے لیے ہے، یہ کہہ کر ان کو ہندی ترجمہ قرآن دے دیا۔ مذکورہ خاتون بہت زیادہ خوش ہوئی اور بہت ہی احترام کے ساتھ قرآن کو اپنے دونوں ہاتھوں سے لیا، اور شکریہ ادا کیا۔
- **اسرائیل میں دعوت:** اسرائیل سے ملنے والی خبروں کے مطابق، اسرائیل میں دعوت کے وسیع مواقع موجود ہیں، اور فلسطینی نوجوانوں کا ایک گروپ مسٹر طارق بن شہاب کی سرکردگی میں بیت المقدس اور ناصرہ (Nazareth)، وغیرہ، میں سیاحوں کے درمیان دعوتی کام کرتا ہے۔ ذیل کا پیغام انھوں نے سی پی ایس انٹرنیشنل، دہلی کے ٹرسٹی اور گڈورڈ بکس کے ڈائریکٹر مسٹر ثانی اثنین خان صاحب کو بھیجا ہے :

  As Salam alaykom Brother, how are you. Let me tell you that the English Quran copies you had sent are almost finished. So when will the next shipment arrive here? We need many, many copies of all languages you have, brother, we need a big shipment.

- **سی پی ایس علماء ٹیم کا دعوتی دورہ:** مولانا سید اقبال احمد عمری (چنئی)، اور حافظ فیاض الدین عمری (حیدرآباد) نے 23 اکتوبر تا 28 اکتوبر 2017 پنجاب کا دعوتی دورہ کیا۔ اس سفر کا سب سے پہلا مقام امرتسر تھا۔ یہاں قرآن ڈسٹری بیوشن کے سلسلے میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں رہیں۔ ائمہ مساجد نے دعوتی کام سے دلچسپی ظاہر کی، اور پنجابی ترجمۂ قرآن لیا۔ اس کے بعد دمدمہ صاحب ٹمپل کے جتھے دار بھائی ہرپریت سنگھ جی سے ملاقات کے لیے دمدمہ صاحب جانا ہوا۔ واضح ہو کہ جتھے دار بھائی ہرپریت سنگھ جی نے قرآن کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے، اور خود ہی اس کی ٹائپنگ بھی کی ہے، جس کے لیے انھوں نے بطور خاص کمپیوٹر ٹائپنگ سیکھی۔ جس وقت یہ دونوں حضرات دمدمہ صاحب پہنچے، اُن دِنوں وہاں حیدرآباد کے سکھوں کے ذمہ دار بھی آئے ہوئے تھے، لہٰذا ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہاں سکھ مت کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ چلتا ہے، اس ادارہ کے طلبا سے انٹرایکشن ہوا۔ اس کے بعد پنجابی یونیورسٹی (پٹیالہ) جانا ہوا۔ وہاں ڈاکٹر حبیب محمد صاحب (جو کہ سی پی ایس کی آئڈیالوجی کو بہت پسند کرتے ہیں، اور دعوت کا کام کرتے ہیں) سے ملاقاتیں ہوئیں اور یونیورسٹی کے ریلیجس اسٹڈیز کے طلبہ کو مولانا فیاض الدین عمری صاحب نے خطاب کیا اور انٹریکشن ہوا۔ اس کے علاوہ پٹیالہ میں قائم ٹہرا انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان سکھ ازم (Tohra Institute of Advanced Studies in Sikhism) میں جانا ہوا۔ وہاں اسلام اور پیس کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد مالیر کوٹلہ کا سفر ہوا۔ وہاں جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، ان میں ڈاکٹر یوسف اور ڈاکٹر اشرف صاحبان بھی ہیں۔ ان دونوں نے پنجابی ترجمۂ قرآن کی

پروف ریڈنگ کی ہے۔ مقامی لوگوں سے انٹریکشن رہا، جس میں دعوتی ذمہ داری کی باتیں ہوئیں۔

- 25 نومبر 2017 کو رائچور، کرناٹک کے مسٹر ظفر علی، پروفیسر خواجہ ظہیر الدین (9886399147) اور امجد احمد، وغیرہ نے اپنے یہاں مشن کو چلانے کے لیے سینٹر فار پیس اینڈ کمیونل ہارمنی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کے افتتاحی پروگرام میں ممبئی ٹیم شریک ہوئی۔

- 26 نومبر 2017 کو سی پی ایس انٹرنیشنل دہلی کے مسٹر فراز خان، مسٹر وکرانت ڈاگر، مسٹر اجئے دیویدی، مسٹر صہیب خان، وغیرہ نے انڈیا ہیبیٹاٹ سینٹر، دہلی میں منعقدہ ٹائم لٹریچر فیسٹیول میں آنے والے لوگوں کو انگریزی ترجمۂ قرآن دیا۔ تمام لوگوں نے اسے شکریہ اور خوشی کے ساتھ قبول کیا۔

- امریکا کے سابق صدر باراک اوباما یکم دسمبر 2017 کو نئی دہلی میں تھے۔ اس وقت انھوں نے ٹاؤن ہال کے نام سے 300 نوجوانوں کی منتخب ٹیم کو خطاب کیا تھا۔ یہ تمام لوگ اوباما فاؤنڈیشن کی جانب سے منتخب کیے گئے تھے۔ ان منتخب شدہ افراد میں دہلی سی پی ایس کے ممبر مسٹر اسد پرویز بھی تھے۔ مسٹر اسد پرویز نے اس موقع پر اداکارہ زائرہ وسیم کو ترجمہ قرآن بطور ہدیہ دیا۔ اس پروگرام میں شریک معروف ٹی وی اینکر مزندھی رازدان نے بتایا کہ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا نام سنا ہے، اور وہ ان کی کتابیں پڑھنا پسند کریں گی۔ لہذا انھیں کتابوں کا ایک سیٹ کوریر کر دیا گیا ہے۔

- 5 دسمبر 2017 کو ایک انڈونیشین وفد نے صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ یہ وفد عیسائی اور مسلمان ریسرچ اسکالروں کا تھا۔ ان لوگوں نے صدر اسلامی مرکز سے اس بات پر انٹرایکشن کیا کہ کس طرح انڈیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں لوکل سطح پر مذہبی ورژڈم کو بڑھاوا ملے (Religious Local wisdom for strengthening social harmony in Indonesia, India and Thailand.)۔ پروگرام کے بعد تمام لوگوں کو انگلش ترجمہ قرآن اور صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک ایک سٹ دیا گیا۔

- 16 دسمبر 2017 کو آسٹریلیا سے مسٹر ڈیو (Dave) صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ مسٹر ڈیو مذہبی رواداری کو بڑھاوا دینے کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کو اپنی کچھ کتابیں دیں۔ ان کو انگریزی ترجمہ قرآن اور امن پر مبنی کچھ کتابیں دی گئیں، جسے انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

- 11 جنوری 2018 کو فادر فرانسس (انڈیا) کی رہنمائی میں جرمن عیسائیوں کے ایک گروپ نے سی پی ایس انٹرنیشنل، دہلی کے ساتھ آئی آئی سی دہلی میں انٹرایکٹیو سیشن کیا۔ پروگرام کے بعد مہمانوں کو قرآن کا جرمن ترجمہ اور جرمن واٹ از اسلام و دیگر انگریزی کتابوں کا ایک ایک سٹ دیا گیا۔ سی پی ایس انٹرنیشنل کے ٹرسٹی ڈاکٹر ثانی اثنین نے بھی فادر فرانسس کو اپنی جرمن کتابوں کا ایک سٹ دیا۔

- 13 جنوری 2018 کو امریکا کے 10 طالب علم پروفیسر عرفان عمر صاحب کی رہنمائی میں صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لیے آئے۔ صدر اسلامی مرکز نے ان کو خطاب کیا، اس کے بعد سوال و جواب کا سیشن بھی ہوا۔

آخر میں تمام اسٹوڈنٹ کو انگلش ترجمہ قرآن اور صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک ایک سٹ دیا گیا۔

- کیرالا سی پی ایس کے مسٹر شبیر علی (K) نے کیرتی انٹرنیشنل فیسٹیول آف بک اینڈ آتھرس میں شرکت کی۔ اس میلہ میں انھوں نے جن لوگوں کو ترجمہ قرآن دیا، ان میں منورما کی چیف نیوز پروڈیوسر مز شنیمول (Shanimol) بھی شامل ہیں۔ یہ میلہ 8-6 مارچ 2018 کو کوچی، کیرالا میں لگا تھا۔

- **نوجوان داعی:** مسٹر اظہر مبارک (بھاگلپور) سی پی ایس کا لٹریچر خود بھی پڑھتے ہیں، اور مختلف مواقع پر لوگوں کے درمیان سی پی ایس کا لٹریچر تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے نیو ہورائزن کالج (بھاگلپور) کی لائبریری کو سی پی ایس کا لٹریچر ہدیۃً پیش کیا اور دو سال کے لئے صدر اسلامی مرکز کی انگلش میگزین 'اسپرٹ آف اسلام' کو کالج کی لائبریری کے لئے جاری کرایا ہے۔

- مز شبینہ علی اور مز شبانہ خاتون کولکاتا ٹیم کی بہت متحرک ممبر ہیں۔ وہ کولکاتا میں سیکولر سطح پر ہونے والے مختلف پروگراموں کو بطور مواقع استعمال کرتی ہیں۔ وہ ان پروگراموں میں جا کر ان لوگوں کو ترجمۂ قرآن اور دیگر دعوتی لٹریچر دیتی ہیں، جہاں تک عام لوگوں کی پہنچ نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں وہ ملاً قوم میں دعوت کا کام کرتی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے دور میں خواتین بھی اسی طرح دعوت کا کام کرسکتی ہیں، جس طرح مرد کرتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ دونوں خواتین نے جن پروگراموں میں حصہ لیا، اور قرآن کو دیکھ کر مدعو حضرات نے جو تاثر پیش کیا، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

☆ 30 November 2017: Century Celebration of Bose Institute Foundation, Bose Institute, Kolkata.

☆ 8 December 2017: Women's Writer Fest, Saturday Club, Kolkata. Award winning Artist Ramanjit Kaur exclaimed excitedly on seeing the Quran that she also would like to have her copy of the Quran. And she believes in the Quran being a divine book since there is a mention of the Prophet in Guru Granth Sahib.

☆ 12 December 2017: Victoria Memorial Hall and The Polish Institute New Delhi presenting 'The Good Samaritans from Markowa', Poland, at Victoria Memorial Hall, Kolkata. Dr. Mateusz Szpytma was so happy to receive the English Quran that he gifted a book authored by him.

☆ 23 December 2017: Stress Management and the Performance Management, Hotel Hindustan International (HHI), Kolkata. Dr. P. Sanjeev Sahni was very excited to see the Quran. On seeing the book 'Leading A Spiritual Life', he invited me to speak on spirituality in a seminar in the O P Jindal Global University, Sonepat.

☆ 29 December 2017: Ecocriticism and Environment Rethinking Literature and Culture, American Center, Kolkata.

☆ 2–4 January 2018: International Seminar to commerate 150th Birth Anniversary of Sister Nivedita. Ramkrishna Mission Institute Of Culture,

Golpark, Kolkata.One scholar remarked after reading‘The Age of Peace’ that he loved reading the book as it has given insight to great peace ideas and he desired that the ideas be propagated to every individual in the world. Another lady scholar from a renowned university said she loved the Quran translation as it was simple and easy.

☆ 11–15 January 2018: 9th Edition of International Apeejay Kolkata Literary Festival (AKLF), St. Paul Cathedral, Kolkata.One famous author, Nabaneeta Dev Sen, on seeing the Quran was overjoyed and excitedly said‘Oh, Quran’! Renowed director Vishal Bhradwaj said happily after he was given the Quran ‘Oh! I was looking for the Quran for a long time.’.

☆ 23-25 January 2018: 15th International Conference on Alternative Perspective and Global Concerns, O P Jindal Global University Sonipat Delhi NCR Haryana.One of the delegates expressed that he read the book‘The Age of Peace’ with tears in his eyes.

☆ 7 February 2018: Presentation on‘Our Journey into Deep Space’, Birla Industrial and Technological Museum, Kolkata.NASA Scientist Dr. Sharmila Bhattacharya said she was honoured to have received a copy of the Quran.

☆ 8–10 February 18: 5th Kolkata Litreture Festival (KLF), Central Park, Kolkata.Professor of English Chinmoy Guha, University of Kolkata, was so delighted to find the little pocket-size Quran in English that he raised it to shoulder level and showed it to his students happily and said‘See, I have a copy of the Quran.’

● شیخ عبدالحق الترکمانی عرب عالم ہیں، اور لیسٹر برطانیہ میں رہتے ہیں۔ وہ صدر اسلامی مرکز سے تین سال قبل ملاقات کر چکے ہیں۔ اُس وقت انھوں نے تین دنوں تک مختلف موضوعات پر صدر اسلامی مرکز سے انٹرویو لیا تھا، اور کافی خوش ہوئے تھے۔ ذیل کا ای میل انھوں نے لکھ کر یہ اجازت طلب کی ہے کہ وہ صدر اسلامی مرکز کی کتاب الاسلام یتحدی (عربی ترجمہ: مذہب اور جدید چیلنج) کا اختصار کرنا چاہتے ہیں :

حضرة العلامة وحيد الدين خان سدد الله قوله وعمله، السلام عليكم ورحمة الله وبركاته :
أسأل الله تعالى أن تكونوا بخير وعافية في الدين والدنيا وأن يديم عليكم نعمة التوحيد والسنة وخدمة الدين بفضله وإحسانه۔ أعرض على حضرتكم حفظكم الله رغبتي في اختصار كتابكم العظيم *الإسلام يتحدى* ذلك لأنني سعيت في طبعه لدى عدة جهات في البلاد العربية فقالوا لي :الكتاب كبير، وقد صار أكثر الناس اليوم لا يقرؤون وليس عندهم صبر على الكتب الكبيرة فلو أمكن اختصار الكتاب إلى مقدار النصف بالتركيز على المسائل والأفكار الأساسية وحذف التفاصيل۔ فأحببت أن أستأذنكم في هذا العمل خاصة مع انتشار الإلحاد في هذه الأيام۔ وتقبلوا بقبول وافر الإحترام والتقدير والله يحفظكم ويرعاكم والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته۔أخوكم :عبدالحق التركماني (في ١١/١/٢٠١٨)

● ایک عرب نے صدر اسلامی مرکز کی مشہور کتاب الاسلام یتحدی کے تعلق سے فتوی اسلام ویب ڈاٹ نیٹ (www.fatwa.islamweb.net) پر یہ سوال پوچھا تھا کہ اس کو پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ دور جدید میں لکھی گئی کتابوں میں وہ ایک افضل کتاب ہے، اس کا پڑھنا فائدہ مند ہے، اس سے ایمان مضبوط ہوتا ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو دعوت کا کام کرتے ہیں:

السؤال :ماهو رأيكم في كتاب الإسلام يتحدى للكاتب الهندي وحيد الدين خان؟ وهل يجوز قراءة هذا الكتاب؟۔ الإجابة: فكتاب :الإسلام يتحدى. للكاتب الهندي وحيد الدين خان، من أفضل الكتب التي ألفت في العصر الحديث، والتي تتناول الدعوة إلى الإسلام وبيان أنه الدين الحق، بأسلوب يناسب ثقافة العصر، ويواجه أمواج الإلحاد والعلمانية، يتميز بعمق الفكرة وقوة الحجة، ويدل على رسوخ الكاتب في العلم، وسلامة منهجه وصحة معتقده وقوة إيمانه، وقراءة هذا الكتاب أمر نافع بإذن الله، لا سيما لمن يتصدى للدعوة إلى الله، ويجابه أصحاب العقائد الباطلة والأفكار المنحرفة. والله أعلم. (رقم الفتوى: 117706)

● My husband and I have read almost all books by Maulana Wahiduddin Khan. We are Pakistanis, living in Germany, and we want to make short educational videos in Urdu based on selected ideas and concepts from Maulana's books, mainly for Pakistani audience, as Ambassadors of Peace. We will be posting these videos on our YouTube channel specially made for this purpose, and Facebook as well, and you can then upload these videos on cpsglobal website for a global audience. This is purely for educational purposes and we do not intend to earn money from these videos in any way. Credit to Maulana will be given in every video and viewers will be expressly informed in every video that the videos are based on Maulana's ideas and books. Reference to respective books will also be given in all the videos to bring viewers' attention to the books. The idea is to propagate Maulana's ideas from his books to everyone, including people who do not or cannot read books. Videos will be short (4–5 mins long), in simple Urdu and will include English on-screen text + visuals + Urdu narration in our voice. In the videos, Maulana's ideas and his explanations of Islamic concepts will be connected to real-world issues and lives of people and Muslims living in Pakistan. We will also propagate his ideas to be applicable to everyone regardless of his religion, nationality, language, etc. With that said, we are seeking Maulana's express written permission for this endeavour and hoping to get a positive response. (Regards, Rida Tahir)

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحیدالدّین خاں کے قلم سے

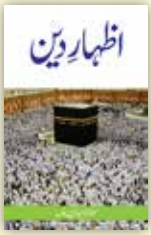

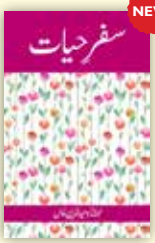

اسلام ایک ابدی حقیقت ہے، لیکن ہر دور میں ضرورت ہوتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو جدید اسلوب میں بیان کیا جائے، تاکہ بدلے ہوئے حالات میں لوگ اسلام کی اہمیت کو دوبارہ دریافت کرسکیں۔ اِس مقصد کے لئے مختلف موضوعات پر تیار کردہ اِن کتابوں کا مطالعہ کریں، نیز قرآن کے ترجمے اور دعوتی لٹریچر برادرانِ وطن تک پہنچا کر اپنا دعوتی رول ادا کریں۔

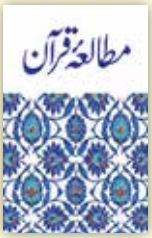

Call: 8588822672, 8588822675 **info@goodwordbooks.com**

Buy online at www.goodwordbooks.com